Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1960ء

آئین پاکستان کی پہلی شق

یہ ہونی چاہئے کہ مملکت پاکستان اپنے جملہ امور قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے سر انجام دینگی اور معاشرہ کی تشکیل قرآن کی مستقل اقدار کے خطوط پر کریگی

We ask that the coming CONSTITUTION OF PAKISTAN should provide that the State shall

(a) adopt for a guide Inviolable Principles detailed in the Holy Quran;
(b) determine all affairs within the four corners of those principles; and
(c) build up social structure on the basis of Quranic Permanent Values.

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گل برگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے:- آٹھ روپے
غیر ممالک سے:- ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون:- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۳ | فروری سنہ ۱۹۶۰ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

لمعات	۲
طلوعِ اسلام کنونشن	۱۱
رابطۂ باہمی	۱۲
سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب)	۱۷
زکوٰۃ — ایک اہم اور اصولی بحث (محترم پرویز صاحب)	۳۰
سرسید احمد خاںؒ (محترم صفدر سلیمی صاحب)	۳۷
حقائق و عبر	۵۴
اسلام کی سرگزشت	۶۵
باب المراسلات (الاعتصام کے الزامات)	۷۲
اختلافِ قرارت (محترم بشیر احمد سوی صاحب)	۷۶
نقد و نظر	۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مرکزی حکومت پاکستان کی طرف سے دسمبر ۱۹۵۹ء میں جو تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تھا اس کی سفارشات اور ان سے متعلق حکومت کے فیصلے حال ہی میں شائع کئے گئے ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ ان سفارشات کے سلسلہ میں کمیشن کی مفصل رپورٹ دیکھ کر گفتگو کریں۔ لیکن وہ ابھی (غالباً) چھپی نہیں اس لئے دستیاب نہیں ہو سکی۔ لہٰذا ہم سرِدست اُسی مختصر رپورٹ پر اکتفا کرتے ہیں جو اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔

تعلیم کے متعلق طلوعِ اسلام کے جو خیالات ہیں، قارئین ان سے واقف ہیں۔ اس کے نزدیک قوم کی پوری کی پوری عمارت اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جس قسم کی (آج کی) تعلیم و تربیت اسی قسم کی (کل کی) قوم۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے تعلیمی کمیشن کے تقرر کے وقت اپنے تبصرہ کی ابتدا ان سطور سے کی تھی۔

> لیکن اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے اُبھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تاکہ وہ قرآنی نظام کی محکمیت اور صلحیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رُو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسی سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی۔ (طلوع اسلام۔ جنوری ۱۹۵۹ء)

لہٰذا تعلیمی کمیشن کی سفارشات کی جو اہمیت ہمارے نقطۂ نگاہ کی رُو سے ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

تعلیمی کمیشن نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا اور (قارئین کو یاد ہوگا کہ) ہم نے بھی اس سوالنامہ کا جواب بھیجا اور اسے طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۵۹ء میں) شائع کر دیا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ کمیشن کی حالیہ سفارشات (اور ان پر حکومت کے فیصلے) کس حد تک ان تجاویز کے مطابق ہیں، جنھیں ہم نے اپنے جواب میں پیش کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں کون کون سی شقیں تشنۂ تکمیل یا محتاجِ توجہ رہ گئی ہیں۔

(۱) سوالنامہ میں یہ دریافت کیا گیا تھا کہ تعلیم کے اخراجات کے سلسلہ میں حکومت کو کس حد تک امداد کرنی چاہیئے۔ بالخصوص ایسے بچوں کی امداد جو اعلیٰ قابلیت رکھتے ہوں لیکن ان کے مالی ذرائع ایسے نہ ہوں کہ وہ تعلیم جاری رکھ سکیں۔ اس سوال کے جواب میں ہم نے لکھا تھا۔

> باقی رہا اخراجات کا سوال۔ سو جب بچوں کی تعلیم مملکت کی ذمہ داری قرار پائے گی تو انفرادی اخراجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مملکت کی ذمہ داری میں ہر بچہ وہ کچھ بن سکے گا جو کچھ بننے کی صلاحیت اس میں ہے۔ کسی کی مضمر صلاحیتیں اخراجات کی کمی یا فقدان کی وجہ سے دبی کی دبی نہیں رہ جائیں گی۔ صلاحیت کی نشو ونما اس صورت میں دب کر رہ جاتی ہے جب ہر بچہ کے ماں باپ کو اس کی تعلیم کا کفیل ٹھہرایا جائے۔ اس صورت میں صرف امیروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ دماغی طور پر کتنے ہی نالائق کیوں نہ ہوں۔ اور غریبوں کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں۔ لیکن جب پوری کی پوری نسل کی تعلیم کی ذمہ دار اسلامی مملکت ہو جائے تو پھر ہر بچہ تعلیم کی اس آخری منزل تک پہونچ سکے گا جس تک پہونچنے کی اس میں صلاحیت ہوگی ...... حکومت کے میزانیہ میں سب سے پہلا حق تعلیم کا ہونا چاہیئے۔ (طلوع اسلام۔ اپریل ۵۹ء)

بلکہ اس سے پہلے بھی ہم نے لکھا تھا کہ

> ہمارے جدید آئین میں اس امر کی صراحت ہونی چاہیئے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہوگی اور اس کے بنیادی خدوخال وہ ہوں گے جنہیں قرآن نے تجویز کیا ہے۔ (طلوع اسلام جنوری ۵۹ء)

تعلیمی کمیشن کی سفارش پر حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ

(۱) ابتدائی آٹھ سال تک کی تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ اور

(۲) جو ہونہار طالب علم، اخراجات کی کمی یا فقدان کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ انہیں وظائف دے کر اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

ہم حکومت کے اس فیصلے پر اسے مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اتنا ہی بہت غنیمت ہے۔ جب اسلامی نظام قائم ہو جائے اور ذرائع پیداوار مملکت کو تحویل میں آجائیں تو پھر تمام بچوں کی پوری کی پوری تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر عاید ہو جائے گی۔

(۲) اساتذہ کی تنخواہوں کے سلسلہ میں، ایک سوال کے جواب میں ہم نے لکھا تھا۔

> اساتذہ کی ملازمت کو، ملک کی باقی ملازمتوں کے مقابلہ میں زیادہ جاذب بنانا چاہیئے تاکہ قوم کے بہترین دل و دماغ سب سے پہلے اس شعبہ کی طرف کھینچ کر آئیں۔ اساتذہ کا مشاہرہ ان کی ضروریات زندگی کے مطابق مقرر ہونا چاہیئے۔ یعنی استاد کی اپنی اور اس کے افراد خاندان کی ضروریات زندگی، ایک معزز شہری کے درجے کے مطابق بہم پہنچائی جانی چاہئیں۔ اسے اس امر کا اطمینان اور یقین ہونا چاہیئے کہ اسے زمانہ ملازمت میں اور اس کے بعد (تاحینِ حیات) اپنی اور اپنے افراد خاندان کی ضروریات زندگی کے لئے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی جب

وہ طبعی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اس طرح مطمئن ہو جائے گا تو اسے اپنی ذات کو نشوونما دینے کی طرف توجہ دینے کی فرصت نصیب ہوگی۔ وہ اپنے اندر سیرت و کردار کی پختگی اور بلندی پیدا کر سکے گا۔ اور اس طرح اپنے شاگردوں کے لئے ضبطِ نفس، بلندیٔ سیرت اور حسنِ ذات کا نمونہ بن سکے گا۔ (طلوعِ اسلام۔ اپریل ۱۹۵۹ء)

اس ضمن میں تعلیمی کمیشن کی سفارش پر فیصلہ یہ ہوا ہے۔

کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی تنخواہ ان کی قابلیت کے مطابق اس طرح مقرر ہونی چاہیئے کہ اس سے انہیں ایک معقول درجہ کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ضمانت مل جائے۔

اگرچہ ہمارے نزدیک اس فیصلہ کو اور زیادہ واضح اور متعین ہونا چاہیئے تھا لیکن بحالاتِ موجودہ اسے غنیمت است۔ البتہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس فیصلہ کو کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ تک ہی محدود کیوں رکھا گیا ہے۔ اسکول ٹیچرز کو اس میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ہمارے نزدیک ابتدائی تعلیم کے معلمین کی اقتصادی حالت کو قابلِ اطمینان بنانا اشد ضروری ہے۔ اس ضمن میں ہمارا خیال تو یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لئے ایسے اساتذہ کا انتخاب ہونا چاہیئے جو ذہنی اور قلبی ہر دو لحاظ سے بہترین صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ اس لئے کہ بچوں کی آئندہ زندگی کی بنیادیں انہی جماعتوں میں تشکیل ہوتی ہیں۔ ان جماعتوں کے اساتذہ کو خاص طور پر قابل، مطمئن، باوقار اور سیرت کے اعتبار سے بلند ہونا چاہیئے اور اس کے لئے اولین شرط معاشی خوش حالی ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ مسئلہ اطمینان بخش طریق پر اسی صورت میں حل ہو سکے گا جب ملک میں قرآن کا معاشی نظام نافذ ہو جس کی رُو سے تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔ معاشی مسئلہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے اور جب تک اس سے متعلق نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوتا، مملکت کے دیگر مسائل کما حقہٗ سلجھ نہیں سکتے۔

(۳) ایک سوال زیرِ غور یہ بھی تھا کہ کیا ابتدائی درجہ کے بچوں کی تعلیم تمام تر عورتوں کے سپرد ہونی چاہیئے؟ اس کے جواب میں ہم نے لکھا تھا۔

یہ انسب اور ضروری ہے کہ ابتدائی جماعت کے بچوں کی تعلیم خالصتہً استانیوں (عورتوں) کے سپرد ہو لیکن یہ استانیاں کم عمر کی لڑکیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ بڑی عمر کی لڑکیاں ہونی چاہئیں۔ ..... ان کی جملہ ضروریات کی ذمہ داریاں حکومت کے سر پر ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں میلی نگاہوں والے عناصر سے ان کی حفاظت کا پورا پورا انتظام ہونا چاہیئے۔ (طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۵۹ء)

اس ضمن میں تعلیمی کمیشن کی سفارش پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ

چھوٹے بچوں کی صلاحیتوں کی بیداری اور سیرت کی تشکیل کے لئے عورتیں طبعاً زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ اس لئے ابتدائی تین جماعتوں میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لئے استانیاں مقرر ہونی چاہئیں۔ بشرطیکہ موزوں استانیاں مل جائیں۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ جوں جوں موزوں اسنانیاں زیادہ تعداد میں ملتی جائیں، چوتھی اور پانچویں جماعت تک کے لڑکوں کے لئے بھی اسنانیاں ہی مقرر کی جائیں۔ عورت کی اگر صحیح تعلیم و تربیت ہو تو وہ بچوں کی سیرت کی تشکیل کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہوتی ہے۔

(۴) ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا مردوں سے الگ عورتوں کی تعلیم خصوصی توجہ کی مستحق ہے؟ اگر جواب مثبت میں ہو تو کس ضمن میں خصوصی توجہ ضروری ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا تھا کہ

> عورتوں کی تعلیم خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ ان کے وظائفِ زندگی مردوں سے مختلف ہیں۔ ان کا دائرۂ سعی و عمل بیشتر گھر سے متعلق ہے اور مردوں کا بیشتر امور بیرونِ خانہ سے۔

گھریلو معاشیات (HOME ECONOMICS) کی تعلیم کے سلسلہ میں ہم نے کہا تھا کہ اسکولوں میں تو اس مضمون کی تدریس صرف اس حد تک ہونی چاہیئے جس سے یہ تعلیم پر عمومی اثر ڈال سکے لیکن کالج میں اس مضمون کو مکمل طور پر پڑھایا جانا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ

> مڈل کی تعلیم کے بعد لڑکیوں کو خاص طور پر سوزن کاری۔ کشیدہ کاری۔ کھانا پکانے اور گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے کاموں کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔

(۵) ذریعۂ تعلیم کے سلسلہ میں ایک سوال کے جواب میں ہم نے کہا تھا۔

> ابتدائی جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم مقامی زبان ہونا چاہیئے۔ ثانوی مدارج میں اردو۔ لیکن جن طلباء نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنی ہو ان کے لئے ثانوی درجہ ہی میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو جانا چاہیئے اور اردو کی حیثیت ثانوی رہ جانی چاہیئے۔ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے۔ [اس کی وجہ الگ نوٹ میں بیان کر دی گئی تھی] (طلوع اسلام اپریل سنہ ۱۹۵۹ء)

اس ضمن میں جو فیصلہ ہوا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ابتدائی درجات میں ذریعۂ تعلیم مقامی زبان ہوگا۔ لیکن اردو لازمی مضمون قرار دیا جائے گا۔ ثانوی میں ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم انگریزی، تاآنکہ اردو کو اس درجہ تک لے آیا جائے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کے قابل ہو جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس کے لئے کم از کم پندرہ سال کا عرصہ درکار ہوگا (مشرقی پاکستان میں یہی حیثیت بنگالی کی ہوگی)

یہاں تک ہم نے ان شقوں سے بحث کی ہے جو اس باب میں مقابلۃً ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں جس کی حیثیت بنیادی ہے۔ یعنی "دینی تعلیم" اس سلسلہ میں ہم نے تعلیمی کمیشن کے تقرر پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا بے محل نہ ہوگا اگر انہیں یہاں دہرا دیا جائے۔ ہم نے (جنوری سنہ ۱۹۵۹ء کے طلوع اسلام میں) لکھا تھا۔

> اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہماری تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان وجود عمل میں آیا ہے صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و حکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہج زندگی اور فلسفۂ حیات اُس کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے

اسی کو اسلام یا الدّین کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام (یا دین) کیا ہے۔ اسکے تقاضے کیا ہیں۔ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہوگا اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا۔ یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے۔ اس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے اور باقی عالم انسانیت کے لئے کیا (وغیرہ وغیرہ) اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہوگی جو اس وقت "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا حاصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے بچوں کے ذہن میں دین سے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا اور کوئی تصور مرتسم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (بلکہ یونیورسٹیاں) سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس سے (غلط یا صحیح) کچھ معلومات تو ہم پہونچ جاتی ہیں۔ دین کی رُوح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔

اب رہے ہمارے مذہبی مدارس۔ سو وہاں کے فارغ التحصیل علماء حضرات کو اسلام سے کتنی واقفیت ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ آپ نے "منیر کمیٹی" کی تحقیقات کے دوران میں لگالیا تھا جب متعدد علماء سے پوچھا گیا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں تو ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا تھا کہ اس کا جواب فی الفور نہیں دیا جا سکتا۔ اور جنہوں نے جواب دیا تھا وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے اندراج میں بھی موجود ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس سلسلہ میں اگر مزید تجربہ کرنا ہو تو ان حضرات کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیجکر کیا جا سکتا ہے کہ "اسلام کسے کہتے ہیں اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟" جوابات خود بتا دیں گے کہ ہمارے ان مکاتب و دار العلوموں میں اسلام کے متعلق کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مدارس کی غایت یہ ہے کہ طالب علموں کو فقہ کے کچھ مسائل بتلا دیئے جائیں (وہ بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین PERSONAL LAWS سے ہو) اور کچھ کتابیں وعظ و نصیحت کی پڑھا دی جائیں تاکہ وہ مساجد کی امامت کے فرائض ادا کر سکنے کے قابل ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ یا نمازِ جنازہ پڑھا دی جائے۔ جمعہ یا عیدین کا خطبہ دیدیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے۔ جو علماء اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح و طلاق کے متعلق فتویٰ دے سکیں۔ یا (جو تقریر کرنی جانتے ہوں وہ) دوسرے فرقہ کے علماء سے مناظرہ کر سکیں۔ باقی رہا "نفسِ اسلام" تو وہ مروجہ تعلیم کی رُو سے، ان حضرات کے سامنے آ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے) حقیقی اسلام پر غیر اسلامی تصورات و نظریات۔ معتقدات و خیالات کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ نہیں سکتی۔ اور ان پردوں کو الگ کر دینا ان حضرات کے بس کی بات اس لئے نہیں کہ انہوں نے انہی پردوں کو اصل اسلام سمجھ رکھا ہے۔ یہ بعینہٖ وہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر یورپ نے مذہب کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے لگ گئے۔ جہاں تک

مسئلہ زیرِ نظر (یعنی تعلیم) کا تعلق ہے یہی حالت ہمارے ہاں بھی ہے۔ یہاں "دینی" تعلیم مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں۔ اس باب میں ہم میں اور اہلِ مغرب میں فرق یہ ہے کہ اس عملی ثنویت (DUALISM) کے باوجود ہم ہر منبر اور اسٹیج سے ہمیشہ پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، روح اور مادہ، دین اور دنیا میں کوئی مغائرت نہیں۔ اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلہ میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم" کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جائے؟ ہمارے ہاں ایک ہی درسگاہ میں عصرِ حاضر کے جملہ علوم کے ساتھ دین کی تعلیم دی جانی چاہیئے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کے ادارہ (INSTITATION) کو ختم کر دینا چاہیئے ..... اب رہا یہ کہ دین کی تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہو؟ سو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ دین کی اصل و بنیاد خدا کی کتاب ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور جو تمام مسلمانوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن ہی اس مقصد و منتہیٰ کی وضاحت کرے گا جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہی بتائے گا کہ مسلمان کا فلسفۂ زندگی کیا ہے اور فریضۂ حیات کیا۔ اسی سے یہ متعین ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ کا اقوامِ عالم میں مقام کیا ہے اور منصب کیا۔ یہی واضح کرے گا کہ مملکتِ پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ یہی اس کی پالیسی کو معین کرے گا اور اسی سے وہ شاہراہِ حیات پر راہ نمائی حاصل کرے گی ..... لیکن قرآنی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرار دیا جائے۔ ہماری تاریخ ہو یا سیرت، فقہ ہو یا روایات سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اس سے وہ غیر اسلامی پردے اٹھ سکیں گے جو ہماری بدقسمتی سے صدیوں سے حقیقی اسلام کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے ہیں اور جب تک یہ پردے نہیں اٹھیں گے ہم دین کو اس کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہی وہ حقیقت تھی جسے ہم نے کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

یونیورسٹی میں قرآن مجید کی وسیع اور گہری تعلیم دی جانی چاہیئے۔ طلبہ کو بتانا چاہیئے کہ اس ضابطۂ حیات کی رُو سے زندگی کا منتہیٰ کیا ہے اور اس کے حصول کا طریقہ کیا۔ یعنی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جو تمام نوعِ انسان کی فلاح و سعود کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی اور اسلامی فکر کی تاریخ بھی پڑھائی جانی چاہیئے۔ اس کا مطالعہ علم و بصیرت کی روشنی میں کرانا چاہیئے اور تنقید کا مدار خالصتہً قرآن کو قرار دینا چاہیئے۔ یعنی انہیں بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ حق و صداقت کے مطابق ہے جو قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے ..... قرآن کریم کی تعلیم شروع سے آخر تک بچے کی ذہنی سطح کے مطابق مسلسل دینی چاہیئے۔ اس سے وہ نسل پیدا ہوگی جو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اس آئیڈیالوجی کو لے کر ابھرے گی جس کے لئے پاکستان کا خطہ حاصل کیا گیا تھا۔

یہ تھا کچھ ہم نے تعلیم کے اس مرکزی نقطہ اور بنیادی سوال کے متعلق کہا تھا۔ تعلیمی کمیشن کی سفارشات پر حکومت نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے وہ درج ذیل ہے۔

نوع انسان کی تاریخ میں تمدنی زندگی کے لئے مذہب بہت بڑی قوت رہا ہے۔ اس سے ہمدردی، رواداری، ایثار اور خدمت خلق کے جذبات بیدار ہوتے ہیں اور انسانوں میں مصنوعی تفریق کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ مذہبی تعلیم سے صحیح صحیح فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس تعلیم کا نظم و ضبط حسب ذیل طریق پر کیا جائے۔

(۱) مذہبی تعلیم کو عام طریق تعلیم کا لاینفک حصہ ہونا چاہیئے۔

(۲) ہمارے ملک میں بہت سے مذہبی عقائد رائج ہیں۔ ان کی تعلیم صرف ان بچوں تک محدود رکھنی چاہیئے جن کے وہ عقائد ہوں۔ یہ تعلیم اس انداز کی قطعاً نہیں ہونی چاہیئے جس سے ملک کی سیاسی اور تمدنی وحدت کو نقصان پہنچے (اس کے برعکس) اس سے انسانی اخوت، عدل، مساوات اور احترام آدمیت کے جذبات کی نشوونما ہونی چاہیئے۔ اور حسن عمل کی اہمیت پر زور دینا چاہیئے۔

(۳) مذہبی تعلیم کے تین ممیز مدارج ہونے چاہئیں۔

(ا) لازمی درجہ

(ب) اختیاری درجہ۔ اور

(ج) تحقیقاتی درجہ

ابتدائی آٹھ سال (یعنی پرائمری اور مڈل تک) مذہبی تعلیم تمام مسلمان طلباء کے لئے لازمی ہونی چاہیئے۔ اس درجہ میں قرآن اور سیرت نبی اکرمؐ کی تعلیم پر زور دینا چاہیئے اور ہر قسم کے اختلافی مسائل کو تعلیم سے خارج کر دینا چاہیئے۔ قرآن باترجمہ پڑھانا چاہیئے لیکن طالب علموں کو اس کا اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ جو استاد ترجمہ جی چاہے پڑھیں۔ نیز استاد کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ وہ قرآن کی کوئی تفسیر بیان نہ کرے۔ نویں اور دسویں میں یہ اختیاری مضمون ہو جانا چاہیئے۔ انٹرمیڈیٹ میں اسے اسلامک اسٹڈیز کا جزو قرار پا جانا چاہیئے۔ یہ مضمون بھی اختیاری ہوگا۔

یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز اختیاری مضمون ہونا چاہیئے۔

(۴) یونیورسٹیوں کو اسلامک اسٹڈیز میں اعلیٰ درجہ کے طالب علم تیار کرنے چاہئیں جو اسلام کی تعبیر اس انداز سے کریں اور اسے ایک ضابطۂ فکر کی شکل میں اس طرح پیش کر سکیں کہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں کا حل اپنے اندر رکھے اور موجودہ زمانے کے سائنٹفک معاشرہ کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

(۵) اسلامک اسٹڈیز کی انسٹی ٹیوٹ قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ اسکیم جو اس اہم بنیادی مسئلے کے سلسلہ میں تجویز کی گئی ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اسکیم ان مقاصد کو پورے کار لانے کا ذریعہ نہیں بن سکتی جو ایک اسلامی معاشرہ کا نصب العین ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے تعلیمی کمیشن کے تقرر کے وقت لکھا تھا اس قسم کی اسکیم اس کمیشن

کے دائرہ تحقیق و سفارشات کے اندر آتی ہی نہیں تھی۔ ہم نے (جنوری ۱۹۵۹ء میں) لکھا تھا۔

> ظاہر ہے کہ یہ چیز اس تعلیمی کمیشن کے حدودِ تحقیق و سفارشات سے باہر ہے۔ اس لئے اس کے دائرہ تحقیق کی توسیع یا دوسرے کمیشن کے تقرر کی ضرورت ہو۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور معاملہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نظم و نسق میں تغیر و تبدل اور اس کے ٹیکنیکل گوشوں میں اصلاح و ترقی تک محدود رکھا گیا تو اس سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کی آرزو کے آئینہ دار محترم صدرِ مملکت کے وہ بیانات ہیں (جن کے اقتباسات شروع میں زینتِ دہ اوراق کئے گئے ہیں)۔

اس سکیم میں کہا یہ گیا ہے کہ آٹھویں جماعت تک قرآن کریم با ترجمہ اور سیرتِ نبوی کی تعلیم دی جائے۔ اس میں کوئی اختلافی مسئلہ زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ نہ ہی قرآن کی تفسیر بیان کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظری اعتبار سے یہ تجویز بڑی معقول ہے۔ ابتدائی تعلیم صرف قرآنِ کریم اور اس کی روشنی میں سیرتِ مقدسہ کی ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے وہ مقصدِ پیشِ نظر کو پورا نہیں کر سکے گا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہمارے ہاں جس قسم کے ترجمے مروج ہیں ان سے (کم از کم آٹھویں جماعت تک کا طالب علم) قرآن کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہی نہیں کہ وہ ان ترجموں کی مدد سے قرآن کو نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس سے اس کے ذہن میں اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکیم میں یہ کہا گیا ہے کہ استاد خود کوئی تفسیر بیان نہ کرے۔ (اور یہ ہے بھی ٹھیک کیونکہ تفسیر کے متعلق خدشہ ہے کہ اس سے اختلافی مسائل پیدا ہو جائیں گے) لیکن جب ترجمہ سے طالب علموں کے ذہن میں کوئی بات صاف نہیں ہو گی تو وہ اس کی وضاحت کے لئے لامحالہ استاد کی طرف رجوع کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے موقع پر استاد کیا کرے؟ اگر وہ خاموش رہتا ہے تو طالب علم کی الجھن دور نہیں ہوتی۔ بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ قرآن کی تفسیر و تشریح ہو جاتی ہے جس کی ممانعت ہے۔ اس سے عجیب و غریب قسم کی عملی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا تھا (اور ہمارا اب بھی یہی خیال ہے کہ) ایک الگ کمیشن مقرر کرنا چاہیئے جس کا مقصد صرف دینی تعلیم کے متعلق تحقیق و سفارشات ہو۔ یہ سوال اتنا اہم، ایسا وسیع اور اس قدر ہمہ گیر ہے کہ کوئی کمیشن ضمنی طور پر اس کے متعلق کوئی اطمینان بخش اسکیم مرتب نہیں کر سکتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اسکیم کم و بیش حسبِ ذیل خطوط پر متشکل ہونی چاہیئے۔

(۱) پانچویں جماعت سے آٹھویں جماعت تک عربی (زبان) کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ اگر عربی زبان کو صحیح سائنٹیفک اصول کے مطابق پڑھایا جائے تو اتنی مدت میں اس زبان پر اس قدر عبور حاصل ہو سکتا ہے جس سے قرآنِ کریم براہِ راست سمجھ میں آجائے۔

(۲) عربی زبان کی تعلیم میں الفاظ اور فقرے زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کے استعمال کئے جائیں اور ان کے صرف لغوی معنی بتلائے جائیں۔

(۳) آٹھویں جماعت تک دین سے متعلق اور کچھ نہ پڑھایا جائے۔ البتہ سیرتِ نبوی کے آسان گوشے، کہانیوں کے انداز میں اس طریق سے پڑھائے جائیں کہ ان میں نہ تو کوئی بات بچے کی ذہنی سطح سے اونچی ہو۔ نہ قرآنِ کریم کی کسی تعلیم کے خلاف۔

(۴) نویں جماعت سے قرآن کریم کی تعلیم کا کورس شروع ہو۔ یہ نصاب اس انداز سے مرتب کیا جائے کہ جس رفتار سے بچوں کی عام

تعلیم میں اضافہ ہو، اسی نسبت سے قرآنی تعلیم کی سطح بلند اور وسیع ہوتی چلی جائے۔ اور یہ سلسلہ یونیورسٹی تک جاری رہے۔ قرآن کے ساتھ سیرت اور تاریخ اس انداز سے پڑھائی جائے کہ اس میں غلط اور صحیح کا معیار قرآن کریم کو قرار دیا جائے۔

(۵) جہاں تک قرآنی فقہ (قوانین) کا تعلق ہے اس کی تعلیم صرف قانون پڑھنے والے طالب علموں کو دی جائے۔ اسلامی مملکت میں قوانینِ شریعت، خود مملکت کے قوانین ہوتے ہیں جو قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے مدون کئے جاتے ہیں۔

(۶) یونیورسٹی کے بعد، ریسرچ کے درجہ میں، علم کے مختلف شعبوں کے ماہرین، اپنے اپنے شعبہ سے متعلق قرآن کی تعلیم کو لیں اور اس کا مطالعہ اپنے زمانے کی علمی سطح تک کر کے، دنیا کو بتائیں کہ قرآن اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

(۷) یہ سب کچھ عام اسکولوں اور کالجوں میں ہو۔ جداگانہ مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کو ختم کر دیا جائے۔ مکتبوں اور دارالعلوموں کا جائزہ، خود تعلیمی کے حدودِ تحقیق و سفارشات میں تھا۔ لیکن اس کی بابت ان کی رپورٹ میں (جو اخبارات میں شائع ہوئی ہے) کچھ نہیں کہا گیا حالانکہ یہ بڑا اہم سوال تھا۔ دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج اور مذہبی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم ایسی ثنویت ہے جسے اسلام کا مزاج کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

بہرحال یہ ہیں وہ موٹے موٹے اصول جو دینی تعلیم کے سلسلہ میں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرتے وقت اور بھی بہت سی باتیں سامنے آ سکتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، یہ سوال افراد کے حل کرنے کا نہیں۔ اس کے لئے ایک جداگانہ کمیشن یا کمیٹی کی ضرورت ہے جو اس کے لئے تفصیلی اسکیم بھی مرتب کرے اور نصاب کے متعلق بھی یہ حاصل تجاویز پیش کرے۔ اس مقام پر ہم اِن الفاظ کو پھر دہرا دینا چاہتے ہیں جن پر ہم نے جنوری ۱۹۵۹ء کے تبصرہ کو ختم کیا تھا۔ یعنی

> ہم محترم صدر مملکت کی خدمت میں باادب لیکن بتاکید گذارش کریں گے کہ وہ قوم اور اسلام کی اس بنیادی ضروریات کو اپنی خصوصی توجہات کا مرکز بنائیں اور اس کے لئے ایسے اقدامات کریں جن سے وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جن کا اظہار انھوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے اور جن میں مملکت کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انھوں نے تعلیم کے مسئلہ کو اِن خطوط پر سلجھا دیا تو بلاشک و شبہ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہو جائے گا۔ اور قرطاسِ زمانہ پر ان کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔

کراچی کے دوستو!

آؤ۔ اور ہر اتوار کی صبح ساڑھے نو بجے، سندھ اسمبلی ہال (متصل سعید منزل) بندر روڈ میں

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی زبان سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی۔ سیاسی اور معاشی مشکلات کا حل کیا پیش کرتا ہے۔

قرآن کی بات ——— مفکرِ قرآن کی زبان سے

——— بزم طلوعِ اسلام کراچی کے زیر اہتمام

طلوعِ اسلام کنونشن

جیسا کہ آپ سابقہ طلوع اسلام میں دیکھ چکے ہیں، طلوع اسلام کی آئندہ کنونشن ۸-۹-۱۰ اپریل کو لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ بعض احباب نے ان تاریخوں کو آگے یا پیچھے کرنے کے لئے کہا ہے۔ ان کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ پچھلے سال کنونشن ۲۰ اپریل کو منعقد ہوئی تھی تو موسم خاصا گرم ہو چکا تھا۔ اس لئے تاریخیں آگے ہی بڑھائی جا سکتیں۔ اور اگر انھیں پیچھے ہٹاتے ہیں تو عید الفطر ساتھ مل جاتی ہے۔ لہٰذا یہ تاریخیں ہی مناسب ہیں۔

(۲) یہ بھی اعلان کیا جا چکا ہے کہ اس مرتبہ رہائش اور کھانے کا انتظام صرف نمائندگان کے لئے ہوگا۔ مبصرین کے لئے نہیں ہوگا۔ وہ عام کھلے اجلاس میں سامعین کی حیثیت سے شریک ہو سکیں گے۔ بعض احباب نے لکھا ہے کہ وہ سالہا سال سے طلوع اسلام کے مسلک اور فکر سے متفق چلے آ رہے ہیں لیکن ایسے مقام میں رہتے ہیں جہاں بزم نہیں بن سکتی۔ نہ ہی قرب و جوار میں کوئی بزم ہے جس سے وہ ملحق ہو سکیں۔ ان پر مبصر کی حیثیت سے شریک اجلاس ہونے کی قید لگا دینا ان پر زیادتی ہوگی۔ ان احباب کا یہ عذر معقول ہے۔ ایسے احباب ادارہ طلوع اسلام کی طرف رجوع فرمائیں۔ ادارہ انھیں خصوصی مدعوئین کی فہرست میں شریک کرنے پر غور کرے گا۔ اس طرح وہ گویا نمائندگان کی حیثیت سے کنونشن میں شریک ہو سکیں گے۔

(۳) پھر دہرا دیا جاتا ہے کہ

(۱) ایک بزم جتنے نمائندگان چاہے کنونشن میں بھیج سکتی ہے۔ نمائندہ کا بزم کا ممبر ہونا ضروری ہے۔

(۲) ہر نمائندہ سے دس روپے رہائش اور خوراک کے اخراجات کے لئے جائیں گے (اس میں چائے یا دیگر مشروبات شامل نہیں ہوں گے) یہ رقم ۵ اپریل تک ــــــ ناظم صاحب ادارہ طلوع اسلام کے پاس پہونچ جانی چاہیئے۔

(۳) ہر بزم کم از کم ایک نمائندہ بطور رضا کار بھیجے گی۔

(۴) اس مرتبہ خاص طور پر ضرورت ہے کہ نمائندگان زیادہ سے زیادہ تعداد میں کنونشن میں شریک ہوں۔

والسلام

(چوہدری) عبدالرحمٰن۔ صدر کنونشن کمیٹی

معرفت بزم طلوع اسلام۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ جاوید منشن

کمرہ ۱۵ (تیسری منزل)۔ لاہور

رابطۂ باہمی

مختلف بزموں کی رپورٹیں

گوجرانوالہ گذشتہ ماہ بزم کے دو اجلاس ہوئے جن میں مقامی احباب کے علاوہ، تت کلاں، جہلو والہ اور گکھڑ کے احباب نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں چوہدری معقول حسین صاحب نے "شانِ قرآن" کے عنوان سے ایک اثر انگیز نظم پڑھی۔ اسلامیہ کالج کے متعلم ریاض احمد صاحب نے اپنے خطاب میں "یقینِ محکم" اور اس کے عملی اثرات کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس اجلاس میں ایک پولیس افسر، امریکن لائف انشورنس کمپنی کے یونٹ منیجر اور اسلامیہ کالج کے ایک طالب علم نے بزم کی رکنیت قبول کی۔ شیخ محمد اقبال صاحب نمائندہ بزم نے "اسلامک آئیڈیالوجی" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسلام اور کمیونزم کے فرق کو نکھار کر پیش کیا۔ اجلاس میں احباب پر زور دیا گیا کہ وہ فرقہ بازی کی سطح سے قطعاً بالاتر ہو کر قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں سرگرم کار ہوں۔ پروفیسر انور بیگ صاحب نے اپنی گرانقدر (غیر مطبوعہ) تصنیف کا پہلا باب سنایا جس میں "رب العالمین" اور "ربوبیت" پر قرآنی نقطۂ نظر سے حسن کارانہ بحث کی گئی ہے۔ احباب کی طرف سے بزم کے رکن ڈاکٹر ایس۔ ایم شریف کی بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب میں کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا۔ طلوع اسلام کے پانچ نئے خریدار بنائے گئے۔ کم و بیش پچاس پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ لائبریری سے کتابوں کا اجرا بھی برائے مطالعہ ہوا۔

رسول نگر (ضلع گوجرانوالہ) بزم کا ماہانہ اجلاس نمائندہ بزم خان بہادر قاضی حفیظ الدین صاحب کے دولتکدہ پر ہوا۔ طلوع اسلام کے تازہ شمارہ سے بزموں کی سرگرمیوں کی رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ ازاں بعد سالانہ کنونشن کے وضاحتی اعلان پر غور و خوض کیا گیا۔ اور کنونشن کے لئے خان بہادر قاضی حفیظ الدین صاحب، جمعدار غلام حسین صاحب اور سردار رحمت اللہ صاحب کو بحیثیت مندوبین منتخب کیا گیا۔ (سید محمد شاہ صاحب اور سید اکبر علی شاہ صاحب بطور مبصر شریک مؤتمر ہونگے۔) اجلاس کے آخر میں محترم خان بہادر نے اپنی تقریر میں احباب پر زور دیا کہ وہ قرآنی مقاصد کی اشاعت (میں) منظم طور پر سرگرم کار ہوں۔

پشاور بزم ہائے شہر و صدر نے اپنے اجلاس میں جو یوسف ضیاء صاحب کے دولت کدہ پر ہوا۔ آئندہ سال کے لئے بالترتیب

شیخ صلاح الدین صاحب اور ماسٹر بدرالدین صاحب کو بالترتیب ہر دو بزموں کے نمائندے منتخب کیا۔ مرزا علی احمد خاں ترجمانِ ضلع مقرر ہوئے۔ بزم کی گذشتہ ماہ کی شائع شدہ رپورٹ میں یہ تصحیح فرما دی جائے کہ بزم نے لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی اشاعت کے سلسلے میں جو یکصد روپے مرکز کو ارسال کئے تھے وہ پہلی قسط نہیں بلکہ بقایا رقم کے سلسلے میں تھے۔ کیمبلپور سے بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب میں ہمارے قرآنی رفیق محترم عبدالحمید صاحب ہمدرد مع اپنے خادم خلق رفقاء کے کامیاب ہوئے ہیں۔ اجلاس میں انھیں اور لشکر کے کامیاب امیدوار کو مبارکباد پیش کی گئی۔

مری

مقامی بزم کے باقاعدہ اجتماع گلبرگہ گلی میں ہو رہے ہیں۔ ۱۱ جنوری کے خصوصی اجلاس میں تعلیمی کمیشن کے طے شدہ فیصلوں کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا گیا۔ کنونشن کے سلسلے میں مرکز کا پیغام احباب کو سنایا گیا۔ ملک حنیف وجدانی بحیثیت رضاکار کنونشن میں شرکت کریں گے۔ پمفلٹوں کی تقسیم باقاعدگی سے ہو رہی ہے۔

ڈیرہ غازی خاں

کراچی سے آمدہ پمفلٹ "ہماری مسجدیں" عوام میں تقسیم کیا گیا۔ درس قرآن کے لئے ایک فاضلِ دیوبند کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ رفیق بزم محترم ظہیر احمد صاحب سویری کی حالیہ انتخابات میں کامیابی پر ہدیہ تبریک پیش کیا گیا۔ ڈیرہ غازی خاں میں اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے خلاف سویری صاحب کو "برہان قاطع" کا درجہ حاصل ہے۔

پنج کسی (ضلع ملتان)

ادارہ طلوع اسلام کے تازہ بتازہ پمفلٹوں نے یہاں کی فضا کو کافی متاثر کیا ہے۔ بالخصوص نئے پمفلٹ (اسلام آگے کیوں نہ چلا؟) سے تو تاریخ کے مستور حقائق نکھر نکھر کر دیدۂ عبرت نگاہ کے سامنے آگئے ہیں۔ جس نے بھی اسے پڑھا بے ساختہ پکار اٹھا کہ زوالِ امت کا راز پہلی بار منکشف ہوا ہے۔ بزم کی مبارک کوششوں سے بنیادی جمہوریتوں کے مقامی نمائندے صلح و صفائی سے چن لئے گئے ہیں اور یہ بستی باہمی رنجشوں کے ان تلخ عواقب سے بچ گئی ہے جن کا خطرہ باہمی مقابلے کی صورت میں سر پر منڈلا رہا تھا۔

سید حسین (ضلع جہلم)

حالیہ انتخابات میں نمائندہ بزم سید امیر حسین شاہ صاحب جان توڑ مقابلے کے بعد عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ لائبریری کی کتابوں اور پمفلٹوں کی تقسیم سے خوشگوار نتائج سامنے آرہے ہیں۔

مردان

محترم پرویز صاحب کی تقریر (مقام محمدی) اصحاب ذوق کی مجلس میں ٹیپ ریکارڈ سے سنائی گئی۔ اور اس نے سب کو کافی متاثر کیا۔ اردو پمفلٹ باقاعدگی سے تقسیم ہو رہے ہیں ادارہ کی دیگر مطبوعات بھی تعلیم یافتہ اصحاب کو برائے مطالعہ دی جا رہی ہیں۔ قرآن کریم کا روزانہ درس بدستور باقاعدگی سے جاری ہے۔

چونڈہ (ضلع سیالکوٹ)

ادارہ کا تازہ پمفلٹ "اسلام آگے کیوں نہ چلا؟" مفت تقسیم کیا جا رہا ہے اور سب نے اسے پسند کیا ہے۔

ننکانہ (ضلع شیخوپورہ)

بزم کے ارکان گذشتہ ماہ بنیادی جمہوریتوں کے سلسلے میں عوامی شعور کی بیداری کے سرگرم کار رہے ہیں۔ نمائندہ بزم محترم برکت علی خاں غیور نے اس سلسلہ میں افسرانِ ضلع کی فرمائش پر "سویرا" کے نام سے ایک ڈرامہ تیار کیا جسے سرکاری عہدیداران کی سرپرستی میں ضلع کے مختلف مقامات پر اسٹیج کیا گیا۔ اور اسکی حیات بخش کرنوں سے ضلع کے عوام میں شعوری طور پر بڑی بیداری پیدا ہوئی۔ یہاں نہ صرف بزم کے سرگرم کارکن محترم محمد صدیق صاحب انتخاب میں کامیاب ہوئے بلکہ ایک اور محترم بھی جو طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے ہم آہنگ ہیں۔

کراچی

بزم کا ماہانہ اجتماع ہر ماہ کے پہلے ہفتے باقاعدگی سے ہوتا ہے اور اراکین بزم ذوق و شوق سے اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اس اجلاس میں گذشتہ ماہ کی کارگذاریوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آئندہ ماہ کے پروگرام بالخصوص ہفتہ وار درس کے اجتماع کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے امکانات اور وسائل زیر غور لائے جاتے ہیں۔

اتوار کا اجتماع جس میں پرویز صاحب کی تقریر ٹیپ ریکارڈ سے سنائی جاتی ہے۔ اب پی ایم اے ہال کے بجائے سندھ اسمبلی ہال میں ہوتا ہے۔ اس اجتماع کی حاضری چار صد کے لگ بھگ ہوتی ہے اور اس تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس اجتماع کے لئے اخبارات میں بھی اشتہار دیئے جاتے ہیں۔ براہ راست بھی اہل علم احباب کو دعوت نامے جاری کئے جاتے ہیں اور بزم کے احباب بھی اپنے اپنے حلقوں میں مطبوعہ کارڈز کا اجراء کرتے ہیں۔ چنانچہ اس صرف کثیر کی بدولت اجتماع کی کامیابی کے امکانات روشن تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ابھی ابھی بزم نے چار ہزار پمفلٹ "ہماری مسجدیں" طبع کرا کر مفت تقسیم کروائے ہیں اور "سلیم کے نام خطوط" کی اہم تصنیف کی دو صد کتابیں تعلیم یافتہ طبقہ میں مفت تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہفتہ وار اجتماع کی تقریب پر کتابوں کا اسٹال بھی ہال کے باہر لگایا جاتا ہے اور اجلاس کے خاتمہ پر پمفلٹوں کی تقسیم بھی کی جاتی ہے۔

لاہور

پندرہ روزہ اجتماع بزم کے دفتر میں باقاعدگی سے شروع ہیں بزم کے نام واجب الادا رقوم کی وصولی کا آغاز کامیابی سے ہو چکا ہے۔ بزم کے دفتر میں ایک دار المطالعہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ جس کے قواعد و ضوابط بالاتفاق مرتب کر لئے گئے ہیں اور ان کی بنا پر ہر شخص اس کا رکن بن سکے گا اور برائے مطالعہ ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات حاصل کر سکے گا۔ بزم کا دفتر روزانہ باقاعدگی سے مقررہ اوقات پر کھلتا ہے۔

سیالکوٹ

ڈاکٹر محمد حیات صاحب ملک کی آمد سے بزم میں زندگی کی نئی لہر پیدا ہو گئی ہے اور وہ احباب بھی جو کبھی شریک اجلاس نہیں ہوئے اب بصد شوق شرکت کر رہے ہیں۔ محترم محمد عبداللہ صاحب بٹ بزم کے نئے نمائندے منتخب ہوئے ہیں۔

ایک بار پھر اعلان کیا جاتا ہے کہ بزموں کی رپورٹ ہر ماہ کی بیس تاریخ تک لازماً دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے۔ ورنہ اشاعت ممکن نہ ہو گی۔

طلوع اسلام کے پرانے پرچے

اگر کسی کو مندرجہ ذیل شماروں کی ضرورت ہو تو ۴ آنہ فی پرچہ خرچ ڈاک ارسال کر کے طلب فرمائیں۔

۱۹۵۳ء مئی، جولائی، اگست، ستمبر، دسمبر۔ ۱۹۵۴ء جنوری تا دسمبر۔ ۱۹۵۵ء جنوری۔ ۱۹۵۶ء مئی۔ نومبر، دسمبر۔ ۱۹۵۷ء اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، دسمبر۔ ۱۹۵۸ء جنوری، مارچ، جون سے دسمبر۔ ۱۹۵۹ء جنوری، فروری، مارچ، مئی، جولائی اگست، ستمبر، اکتوبر، دسمبر۔ ہفتہ وار جلد ۸ شمارہ نمبر ۵ سے ۱۸، ۲۰ سے ۲۶، ۲۸، ۳۶، ۳۷، ۳۹ سے ۴۷، ۴۹

خواجہ محمد حسین، ترجمان بزم طلوع اسلام۔ حاجی پورہ۔ گوجرانوالہ

چند اچھی کتابیں

۱۔ اسلامی دستور اور اسلامی اقتصادیات کے چند پہلو

(از: نصیر احمد شیخ۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل بی۔)

اس کتاب میں اسلام کے معاشی مقام کو نمایاں کرکے بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی دستور اسلامی کہلا سکتا ہے جس میں افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی باافراط اور بآسانی پوری ہوتی رہیں۔ نیز یہ کہ زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ بحث مدلل، اور معلومات کثیر۔ دوسرا ایڈیشن۔ صفحات ۴۰۰ قیمت -/۶ روپے

۲۔ ابوبکرؓ

سیرت حضرت ابوبکر صدیقؓ۔ مصنفہ محمد حسین ہیکل (مصری)

خلافتِ راشدہ کی حسین جھلک۔

صفحات ۶۷۵ قیمت -/۱۰ روپے

۳۔ عمرو بن العاصؓ

سیرت حضرت عمرو بن العاصؓ فاتح مصر۔ مصنفہ ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن پی۔ ایچ۔ ڈی (مصری) قرنِ اوّل کا تابندہ منظر

صفحات ۳۱۰ قیمت -/۵ روپے

۴۔ خالد سیف اللہؓ

حضرت خالد بن ولیدؓ کی زندگی اور فتوحات

مصنفہ۔ ابوزید شبلی ترجمہ۔ شیخ محمد احمد پانی پتی

سیف اللہ کی خارہ شگافیوں کی عظیم داستان

صفحات ۳۲۸ قیمت -/۵ روپے

۵۔ تقسیمِ ہند

جس میں تحریک پاکستان کے اُن خطوط و نقوش کو اجاگر کیا گیا ہے جن کو "انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا آزاد مرحوم نے مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ پُر از معلومات کتاب۔ بصیرت افروز اور حقیقت کشا۔

مصنفہ عبدالوحید خان۔ صفحات ۳۹۲ قیمت -/۶ روپے

ملنے کا پتہ:-

مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

انسان نے کیا سوچا؟

کا تازہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے مقابلہ میں بے حد حسین، تابناک اور صحیح چھپا ہے۔ مصنف کی نظرِ ثانی نے کتاب کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی مثال انسانی کوششوں میں اور کہیں نہیں ملے گی اور جو صدیوں تک بھی پرانی نہیں ہوگی۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پرویز صاحب جیسے مفکر کے بیس سال کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

اعلیٰ درجہ کی طباعت۔ جلد۔ گرد پوش۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت

قیمت۔ بارہ روپے RS. 12/-

آپ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں ——— ؟

اس کے لئے کسی مشکل، دقیق، پیچیدہ کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس مرحلہ کو مفکرِ قرآن جناب پرویز نے

سلیم کے نام خطوط

میں آسان کر دیا ہے۔ حسین شگفتہ انداز میں بڑے بڑے مسائل اس طرح بیان کر دیئے ہیں کہ ہو نہیں سکتا کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسے پڑھے اور صحیح اسلام کا والہ و شیدا نہ ہو جائے۔

جلد اول:۔ جو پہلے ایڈیشن سے مختلف ہے سترہ خطوط پر مشتمل ہے۔ صفحات قیمت ۸/- روپے

جلد دوم:۔ جو بارہ خطوط پر مشتمل ہے۔ صفحات قیمت ۶/- روپے

دونوں جلدیں حسین دیدہ زیب ٹائپ میں چھپی ہیں۔ اور مجلد گرد پوش سے مزین ہیں۔

ملنے کا پتہ:———

مکتبہ طلوعِ اسلام ———

——— ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

جہاں سے ہر قسم کی کتابیں مل سکتی ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

سلیم کے نام

(فرائض رسالت۔ بسلسلۂ "اسلام آگے کیوں نہ چلا؟")

مجھے خوشی ہوئی سلیم! کہ میرے سابقہ خط سے تمہارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اپنے ذاتی معتقدات و نظریات سے الگ ہٹ کر قرآن کریم پر غور و فکر کرے تو شکوک و شبہات باقی رہ نہیں سکتے۔ یہی تو اس کتاب عظیم کا اعجاز ہے۔

جس نقطہ کی تم نے مزید وضاحت چاہی ہے، وہ فی الواقعہ ایک مستقل موضوع ہے۔ اور سابقہ خط میں وہ محض ضمناً سامنے آیا تھا۔ مختصر الفاظ میں تمہارا سوال یہ ہے کہ تشکیلِ دین کے سلسلہ میں جو کچھ نبی اکرمؐ نے کیا تھا، وہ اگر آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت سے تھا، تو پھر حضورؐ کے بعد کوئی اور اُن امور کو انجام نہیں دے سکتا تھا۔ نہ ہی اب دے سکتا ہے، (کیونکہ نبوت حضورؐ کی ذات پر ختم ہو چکی ہے)۔ لہٰذا حضورؐ کی وفات کے بعد دین کی وہ شکل قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ نہ ہی اب دوبارہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں یہ سوال بے کار ہے کہ "اسلام آگے کیوں نہ چلا"۔ وہ آگے چل ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اگر وہ ایسے امور تھے جنہیں "غیر از نبی" بھی سرانجام دے سکتے تھے (اور دے سکتے ہیں) تو پھر اسلام کا وہی سلسلہ بدستور قائم رکھا جا سکتا تھا (اور اب بھی) اسے قائم کیا جا سکتا اور آگے چلایا جا سکتا ہے۔ اس خط میں اسی نقطہ کی مزید وضاحت مقصود ہے اگرچہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے ضمناً یہ نقطہ سابقہ خط میں بھی سامنے آ چکا ہے۔

نبی اور رسول

قرآن کریم کی رُو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحب کتاب ہوتا ہے اور نبی صاحب کتاب نہیں ہوتا، یہ قرآن سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے ہر مامور من اللہ (خواہ اسے نبی کہہ کر پکارا جائے یا رسول کہہ کر) صاحب کتاب ہوتا ہے۔ سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ کے متعلق کہا ہے کہ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۲:۲۱۳) اللہ نے ان سب کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب

نازل کی"۔ اور سورۂ حدید میں رسولوں کے متعلق ارشاد ہے۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ (۲۵/۵۷)۔ "ہم نے ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی"۔ یہ بات ہے بھی بالکل ٹھیک۔ جو بھی خدا کی طرف سے آئے گا وہ خدا کا پیغام لے کر آئے گا (اسی کو خدا کی کتاب کہتے ہیں)۔ اگر وہ خدا کا پیغام لے کر نہیں آتا تو اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ لہٰذا نبوت اور رسالت میں اس جہت سے کوئی فرق نہیں۔ لیکن جو سوال تم نے اٹھایا ہے اسے ذہن

نبوت اور رسالت

نشین کرنے کی خاطر اتنا سمجھ لو کہ (میرے اس خط میں) "نبوت" سے مفہوم ہوگا نبی اکرمؐ کا خدا کی طرف سے وحی پانا۔ اور "رسالت" سے مقصود ہوگا، اس وحی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنا۔ اسے عملی شکل میں نافذ کرنا۔ اس اعتبار سے نبوت نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہوگئی۔ حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا سے وحی نہیں پا سکتا۔ خدا نے جس قدر وحی انسانوں کی راہنمائی کے لئے بھیجنی تھی وہ قرآن کریم میں منضبط ہوگئی اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لے لیا۔ لہٰذا اب گفتگو صرف ان امور کے متعلق رہ جاتی ہے جنہیں حضورؐ نے اس وحی کو ایک عملی نظام کی شکل میں نافذ کرنے کے سلسلے میں سرانجام دیا تھا۔ ان امور کو محض سمجھنے سمجھانے کی خاطر "فرائض رسالت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب تم غور سے سنو کہ یہ فرائض رسالت کیا تھے اور آیا یہ فرائض (نبوت کی طرح) حضورؐ کی ذات تک محدود تھے یا ان کا سلسلہ آگے بھی چل سکتا تھا؟

تبلیغ رسالت

خدا کی طرف سے وحی پانے کے بعد رسول کے ذمے سب سے پہلا فریضہ یہ عاید ہوتا تھا کہ وہ اس وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ اپنی ذات تک ہی محدود نہ رکھے۔ چنانچہ حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ

یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ
رِسَالَتَہٗ (۶۷/۵)

اے رسول! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے اسے (دوسروں تک) پہنچاؤ۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو نے خدا کے پیغام کو (دوسروں تک) نہیں پہنچایا۔

یعنی رسول کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کی وحی کو، جو اس پر نازل کی جائے، دوسروں تک پہنچائے۔

تصوف اور نبوت

میں نے تمہیں ایک خط میں تصوف کے متعلق تفصیل سے لکھا تھا۔[1] تمہیں یاد ہوگا کہ اس میں میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب کسی صوفی سے کہا جائے کہ جو کچھ آپ نے دیکھا ہے (یعنی "مشاہدہ حق") ذرا ہمیں بھی بتلایئے کہ اس کی کیفیت کیا ہے، تو اس کے جواب میں وہ کہے گا کہ یہ باتیں سمجھنے سمجھانے کی نہیں۔ خود مشاہدہ کرنے کی ہیں۔ کون کسی کو بتا سکتا ہے کہ "شراب کے نشے کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟"

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

---

[1] یہ خط "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم میں شائع ہو رہا ہے جو زیر طبع ہے۔

تم وہاں کے احوال و کوائف کا پوچھتے ہو؟ وہاں کی تو کیفیت یہ ہے کہ

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد

جسے وہاں کی کچھ خبر ہو جاتی ہے، پھر خود اس کی اپنی خبر بھی نہیں ملتی (کہ وہ کہاں گیا اور اس کے ساتھ کیا ہوا؟)۔ یہ اہلِ تصوف کی باتیں ہیں (جو محض باتیں ہی باتیں ہیں)۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اسے خدا کی طرف سے جن حقائق کا علم حاصل ہوتا ہے، وہ ان حقائق کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اس طرح انھیں بھی "اس بادہ کے نشہ میں" برابر کا شریک کر لیتا ہے۔ نبوت اور تصوف کے اس فرق کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کے متعلق میں اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ لیکن یہ وہ حقائق ہیں جنھیں جتنی مرتبہ سامنے لایا جائے، کم ہے ـــــ تاج محل کو جتنی مرتبہ بھی دیکھئے، ہر بار ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شیکسپیر کے الفاظ میں حسن مسرتِ دوام کا موجب ہوتا ہے (A THING OF BEAUTY IS JOY FOR EVER) سنو، وہ اس باب میں کیا لکھتے ہیں۔

"محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجرد گاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقاصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے، وہ کس انداز کی ہے۔

بہرحال رسول کا پہلا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ یہ گویا تشکیلِ معاشرہ کی پہلی اینٹ ہوتی ہے۔

دعوت علیٰ وجہ البصیرت | رسول اپنا یہ پیغام دوسروں تک، علیٰ وجہ البصیرت پہنچاتا ہے۔ اس میں کسی معجزہ یا فوق الفطرت

قوت سے کام نہیں لیتا۔ وہ دلیل و برہان کی رُو سے اپنا پیغام دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جو اسے نہیں مانتے ان سے بھی دلیل و برہان طلب کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی عقل و فکر اور دانش و بینش کو اپیل کرتا ہے اور اس طرح اپنے پیغام کی حقانیت کو ثابت کر کے اسے دوسروں سے منواتا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (۱۲/۱۰۸)

(ان سے کہدو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی (ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور ایسا ہی کریں گے)

اس میں زبردستی نہیں

رسول کو اس کا بھی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جسے چاہے صحیح راستے پر لگا دے۔ یعنی اس سے اپنا پیغام منوالے۔ اس کا کام پیغام پہنچا دینا ہے ماننا نہ ماننا دوسروں کے اختیار میں ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۲۸/۵۶) "تو اسے ہدایت نہیں دے سکتا جسے تو محبوب رکھے۔ لیکن اللہ اسے ہدایت دیتا ہے جو ہدایت لینا چاہے"، یا جسے اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق ہدایت دے۔ اور وہ "قانون مشیت" یہ ہے کہ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۰۰)، جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔

ایمان کے معنی ہیں کسی بات کی صداقت کو برضا و رغبت۔ بطیبِ خاطر تسلیم کر لینا ظاہر ہے کہ اس طرح اعترافِ حقیقت میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول نہ تو کسی سے بزورِ شمشیر اپنے پیغام کو منواتا ہے (کہ یہ جسمانی اکراہ ہے) اور نہ ہی معجزات کے ذریعے (کہ یہ ذہنی اکراہ ہے)۔ سورۂ یونس میں ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰/۹۹)

اگر تیرے رب کی مشیت ہوتی تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب ایمان لے آتے (وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا) تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

رسول کی بشریت

یہی وجہ ہے کہ رسول بار بار اعلان کرتا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ اس کے مخالف جو اپنی توہم پرستیوں کی بنا پر سمجھتے تھے کہ رسول کو مافوق البشر ہونا چاہیئے۔ اس پر اعتراض کرتے۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ ...... يَاْكُلُ مِنْهَا ...... (۲۵/۷-۸) اور کہتے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے (اگر یہ خدا کا فرستادہ تھا تو) اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ساتھ ہو کر لوگوں کو ڈراتا۔ یا اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جاتا۔ یا اس کا کوئی (طلسماتی قسم کا) باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا...... یعنی انہیں اس پر اچنبھا ہوتا کہ رسول بھی انہی جیسا ایک انسان کیوں ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ ...... الْاَسْوَاقِ ...... (۲۵/۲۰)

"ہم نے تجھ سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں بھیجے مگر یہ کہ وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے......"

یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے ان امور کی اس قدر وضاحت یہ بتانے کے لئے کی ہے کہ نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی کا ملنا خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی وہ مافوق الفطرت خاصہ تھا۔ لیکن اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں کوئی مافوق الفطرت قوت یا ذریعہ کارفرما نہیں تھا۔

جماعت کی تشکیل

جو لوگ اس طرح رسول کے پیغام کو تسلیم کر لیتے، رسول انھیں ایک جماعت کے رشتے میں منسلک کر جاتا۔ شاہراہِ حیات پر گامزن ہونے کے لئے انھیں ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دیئے جاتا۔ اسے تزمیل کہتے ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہ کو یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ کہہ کر پکارا گیا ہے (۷۳/۱)۔ یعنی نہایت حسن و خوبی اور شدت و کثرت سے عمل تزمیل کرنے والا۔ قافلہ کی بہت عمدہ ترتیب دینے والا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ الدین اپنے اپنے طور پر لوجا پاٹ یا الیشور بھگتی کا نام نہیں۔ یہ اجتماعی نظامِ زندگی ہے اور رسول کا فریضہ ہم آہنگ افراد کو جماعت کے رشتے میں پرونا ہے۔

یہ جماعت محض فارم ممبری پر دستخط کرنے سے وجود میں نہیں آتی۔ اس کے لئے ان کی تعلیم و تربیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ

تعلیم و تربیت

چیز بھی فرائضِ رسالت میں داخل ہوتی ہے۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۵۱) "جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ وہ خدا کی آیات تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تمہاری ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے اور تمہیں قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔" وہ انھیں تلقین کرتا کہ وہ کتاب اللہ کا اتباع کریں۔ اور اس کے سوا کسی اور کی بات نہ مانیں۔

اتباعِ کتاب اللہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ..... (۷/۳) "جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے سوا کسی دوسرے چارہ سازوں کا اتباع نہ کرو۔"

لیکن وہ کتاب اللہ کے اتباع کی تلقین صرف اس کی جماعت کے افراد ہی کو نہیں کرتا۔ خود بھی اس کا اتباع کرتا ہے۔ اور اس کا کھلے الفاظ میں اعلان کرتا ہے قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ (۷/۲۰۳)۔ ان سے کہو کہ میں صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔

اس جماعت کے ایمانِ محکم اور عملِ پیہم سے آہستہ آہستہ ایک مملکت وجود میں آجاتی ہے جس میں یہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ خود بھی خالص قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اور دوسروں کو بھی ان کی انسانیت ساز برکات میں شریک کر سکیں۔ یہ مملکت

مملکت کی تشکیل

یونہی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آجاتی بلکہ خدا کے اٹل پروگرام کے مطابق تشکیل ہوتی ہے جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ..... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵) "جو لوگ تم میں

سے ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں' ان سے اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انھیں استخلاف فی الارض (ملک میں حکومت) عطا کرے گا جیسا اس نے ان لوگوں کو حکومت عطا کی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اور وہ ان کے لئے ان کے اس دین (نظامِ زندگی) کو تمکن کر دے گا جو ان سے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اور وہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ (اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ) وہ صرف میری محکومی اختیار کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور جو کوئی اس کے بعد اس راہ سے انکار کر دے گا تو یہی لوگ ہوں گے جو (امن و آزادی کی) اس راہ سے نکل کر دوسری راہ پر چل پڑیں گے۔" اس مملکت کے قیام کے لئے انھیں ان کے "مخالفین کی زمینوں، بستیوں اور مال و دولت کا وارث" بنا دیا جاتا ہے۔ (۳۳/۲۴)۔

سورۂ نور کی مندرجہ بالا آیت (۲۴/۵۵) میں کہا گیا ہے کہ یہ اسی قسم کا استخلاف فی الارض ہے جس قسم کا تم سے پہلے ان اقوام کو عطا ہوا تھا جنھوں نے ایمان و اعمالِ صالح سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۔ (۴/۵۴) یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آلِ ابراہیم کو کتاب اور حکمت بھی عطا کی اور ایک بہت بڑی مملکت بھی۔

صدرِ مملکت

ظاہر ہے کہ اس مملکت کا رئیس (HEAD OF THE STATE) بھی رسول ہی ہوتا تھا۔ اس کی موجودگی میں اور کون صدرِ مملکت ہو سکتا تھا؟ وہ اس مملکت میں "معروف کا حکم دیتا اور منکر سے روکتا" (۷/۱۵۷)۔ یعنی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرتا۔ سورۂ نساء میں ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ..... (۴/۱۰۵) ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تو لوگوں میں اس علم کی رُو سے جو اللہ نے تجھے دیا ہے (متنازعہ فیہ امور کے) فیصلے کرے۔" اس لئے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

مملکت کے واجبات کی وصولی

رسول صدرِ مملکت کی حیثیت سے، لوگوں سے مملکت کے واجبات وصول کرتا ہے۔ (۹/۱۰۳؛ ۸/۱؛ ۵۹/۷)۔ ان آیات میں مالِ غنیمت، انفال، فئے، صدقات وغیرہ کی وصولی کا ذکر ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں فوجوں کی کمان بھی کرتا ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۚ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۳/۱۲۰)

اور جب تو صبح سویرے اپنے اہلِ خانہ سے رخصت ہوا۔ اور پھر (میدانِ جنگ میں) مومنین کو لڑائی کے مورچوں پر بٹھاتا تھا۔ اور اللہ (سب کچھ) سننے والا جاننے والا ہے۔

فوجوں کی کمان

چنانچہ قرآن کریم میں متعدد لڑائیوں کا ذکر ہے جن میں رسول اللہ بہ حیثیت سپہ سالار شریک تھے۔

امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے، وہ مختلف علاقوں میں افسرانِ ماتحت مقرر کرتا ہے۔ اور لوگوں کے نام فرمان جاری کرتا ہے کہ وہ ان افسران کے احکام کی اطاعت کریں۔ لیکن لوگوں کو ان افسروں کے فیصلوں کے خلاف اپیل کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ اپیل، مرکزِ مملکت (یعنی خود رسول) کے پاس آتی ہے جس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوتا ہے۔ سورۂ نساء کی اس آیت میں اسی نظامِ مملکت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ

افسرانِ ماتحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۴/۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی۔ اور تم میں سے جو صاحبِ اختیار بنا دیئے جائیں ان کی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں (تمہارا اور ان افسرانِ ماتحت کا) تنازعہ ہو جائے تو اس معاملہ کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ (طریقِ کار) بہتر اور انجامِ کار اچھا ہے۔

میں تمہیں سلیم! اس سے پہلے متعدد خطوط میں بتا چکا ہوں کہ قرآن میں "اللہ اور رسول" کی اطاعت سے کیا مقصود ہے، اس لئے اس نقطہ کی مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس مقام پر میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسول (بہ حیثیت صدرِ مملکت) افسرانِ ماتحت کا تعین کرتا ہے اور ان کے فیصلوں کے خلاف اپیل سنتا ہے۔

وہ یہ تمام نظم و نسق، اپنی جماعت کے مشورہ سے کرتا ہے۔ اسے خدا کی طرف سے اس کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ..... (۳/۱۵۹)۔ تو معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کیا کر۔ اور پھر جب کسی معاملہ کا فیصلہ کرلے اور اسے انجام دینے کا تہیہ۔ تو قانونِ خداوندی کی تحکیم پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہو جا۔

باہمی مشاورت سے

اپنی جماعت کے ساتھ یہ مشاورت محض "رسمی" نہیں ہوتی تھی۔ قرآن نے اس جماعت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۸/۶۴)۔ اس آیت کے یہ معنی بھی ہیں کہ اے نبی! اللہ تیرے لئے، اور مومنین میں سے جو تیرا اتباع کرتے ہیں ان کے لئے کافی ہے۔ اور یہ معنی بھی کہ اے نبی! اللہ اور مومنین میں سے جو تیرا اتباع کرتے ہیں، وہ تیرے لئے کافی ہیں۔ یہی وہ جماعتِ مومنین ہے جس کا ذکر قرآن نے اس وجد و مسرت کے ساتھ کیا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ..... أَجْرًا عَظِيمًا (۴۸/۲۹)۔ محمد اللہ کا رسول۔ اور اس کے ساتھی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور باہم گہرے ہمدرد اور شفیق۔ تو انہیں دیکھتا ہے۔ کبھی رکوع میں ہیں، کبھی سجدے میں (ہمیشہ قوانینِ خداوندی

جماعت کی اہمیت

کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے) وہ اپنے رب کا فضل اور اس کے قوانین سے ہم آہنگی چاہتے ہیں۔ اطاعتِ خداوندی کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ تورات اور انجیل میں یہ ان کی مثال ہے ــــ کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی ننھی سی سوئی نکالتی ہے۔ پھر اسے مضبوط کرتی ہے سو وہ موٹی ہو جاتی ہے۔ پھر اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ کسان کا دل اس (کھیتی کی برومندی سے) باغ باغ ہو جاتا ہے اور ان کے مخالفین اس سے غم و غصہ میں (اپنی انگلیاں کاٹتے) ہیں۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لاتے اور اعمالِ صالح کرتے ہیں، اللہ نے ان سے (تباہیوں سے) حفاظت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔" یہ تھی وہ جماعت جس کے ساتھ مشورے سے رسول اللہ امور

اجتہادی غلطیاں

مملکت کو سرانجام دیتے تھے۔ ان فیصلوں میں کبھی غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ اس کے متعلق قرآن میں ہے کہ

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰)

ان سے کہہ دو کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو یہ (غلطی) میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (اور اس کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے) اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو یہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ (سب کچھ) سننے والا (اور سب کے) قریب ہے۔

خدا کی طرف سے تادیب

اگر یہ اجتہادی غلطی ایسی ہوتی جس کا اثر دین کے کسی اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی ہو جاتی۔ (مثلاً) ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہ جانے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے انھیں اجازت دیدی۔ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِیْنَ (۹/۴۳) "اللہ تجھے معاف کرے۔ تو نے کیوں انھیں اجازت دیدی (انہیں اجازت نہیں دینی چاہیئے تھی) تاکہ تجھ پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور تو معلوم کر لیتا کہ کون جھوٹے ہیں۔" اسی طرح سورہ تحریم میں ہے کہ حضورؐ نے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا۔ چونکہ آپ کے اس فیصلے کے نتائج بڑے دور رس ہو سکتے تھے اس لئے قرآن میں تادیب آگئی کہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ...... (۶۶/۱) "اے نبی! جو اللہ نے تیرے لئے حلال ٹھہرایا ہے اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے؟" سورہ عبس میں ہے عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ...... (۸۰/۱) "(تو نے اے رسول) برا منایا اور منہ پھیر لیا، اس بات پر کہ تیرے پاس اندھا (کیوں) آگیا؟ تجھے کیا خبر ہے کہ شاید یہ اندھا (مسلم) اپنی ذات کو نشوونما دے لیتا یا (کم از کم) نصیحت قبول کر لیتا اور اسے نصیحت فائدہ دے جاتی۔ جو (قوانینِ خداوندی کی) پرواہ نہیں کرتا۔ (اور اپنے آپ کو اس سے مستغنی سمجھتا ہے) تو اس کی طرف تو متوجہ ہوتا ہے (حالانکہ اگر وہ اپنی ذات کی نشوونما نہ کرنا چاہے تو اس سے، تجھ پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا۔ (اس کے برعکس) جو تیرے پاس دوڑا آتا ہے اور (قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب سے) ڈرتا ہے اس سے بے رخی برتتا ہے۔"

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ وحیِ خداوندی کی روشنی میں امورِ مملکت کے سرانجام دینے میں، جزئی معاملات میں رسول سے

اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ نیز آپ (بحکم خداوندی) اس کا اعلان بھی کرتے رہتے تھے کہ مجھے خدائی اقتدارات میں کوئی عمل دخل نہیں۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ..... لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۷/۱۸۸) "ان سے کہہ دو کہ میں (اور تو اور) خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ بجز اس کے جو اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق وارد ہو۔ اور اگر میں علم غیب رکھتا تو بہت سا مال و دولت (یا اچھی اچھی چیزیں) اپنے لئے اکٹھا کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میرا فریضہ تو صرف یہ ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کریں انہیں ان کی اس روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دوں۔ اور جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں، انہیں ان کے حسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دوں۔

خدائی اقتدارات میں دخل نہیں

نہ ہی رسول خدا کی وحی (قرآن) میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکتا تھا۔ سورۂ یونس میں ہے۔

قرآن میں تبدیلی نہیں کر سکتا تھا

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا ..... يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)

جب ان کے سامنے ہمارے واضح احکام پیش کئے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ (جس میں ان کے مطلب کی باتیں ہوں) یا اس میں کچھ تبدیلی ہی کر دو۔ ان سے کہو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردوبدل کر دوں۔ میں تو بس اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں عذاب کے بہت بڑے دن سے ڈرتا ہوں۔

فرائضِ رسالت

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا سلیم! کہ رسالت کے فرائض کیا تھے۔ مختصر الفاظ میں دہرا دوں کہ رسول کا فریضہ یہ تھا کہ

(۱) وحیٔ خداوندی کو لوگوں تک پہنچائے۔

(۲) یہ دعوت و تبلیغ، علیٰ وجہ البصیرت ہوتی تھی جس میں کسی مافوق الفطرت قوت سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔

(۳) جو لوگ علم و بصیرت کی بنا پر اس دعوت کو قبول کرتے تھے، انہیں ایک جماعت کے رشتے میں پرو دیا جاتا تھا۔

(۴) اس جماعت کی ذہنی اور قلبی تعلیم و تربیت بھی رسول کے فرائض میں داخل تھی۔

(۵) رسول خود بھی، وحیٔ خداوندی کا اتباع کرتا تھا اور اپنی جماعت سے بھی اس کی اطاعت کراتا تھا۔

(۶) اس جماعت کے ایمان و اعمالِ صالحہ سے آہستہ آہستہ ایک مملکت وجود میں آجاتی تھی جس کا صدرِ اول خود رسول تھا۔

(۷) رسول وہ تمام فرائض ادا کرتا تھا جو مملکت کو چلانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ وہ مملکت کے واجبات وصول کرتا اور انہیں مناسب مقامات پر صرف کرتا تھا۔ افسرانِ ماتحت کا تقرر کرتا اور ان کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتا تھا۔ افرادِ مملکت کے اعمال کی

نگرانی کرتا تھا (۲/۱۴۴)۔ حتیٰ کہ لڑائیوں میں عند الضرورت، فوجوں کی کمان بھی کرتا تھا۔

(۸) یہ تمام فرائض، اپنی جماعت کے مشورے سے سرانجام دیتا تھا۔ اس جماعت کو دین کے نظام میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔

(۹) ان امور کے فیصلوں میں بعض اوقات غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ اگر غلطی (SERIOUS) قسم کی ہوتی تو اس پر وحی کی رُو سے تادیب بھی ہو جاتی تھی۔

(۱۰) رسول کو خدائی اختیارات و اقتدارات میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی وہ وحی خداوندی میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا مجاز تھا۔ وہ وحی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، باہمی مشاورت سے نظام مملکت کو قائم کرتا اور آگے بڑھاتا تھا۔

تم سوچو سلیم! کہ ان میں کوئی فریضہ بھی ایسا ہے جو رسول اللہ کی ذات گرامی سے مخصوص ہو اور جو حضورؐ کی وفات کے بعد آگے نہ چل سکتا ہو؟ قطعاً نہیں۔ یہ تمام فرائض ایسے تھے جنہیں حضورؐ کے جانشین (خلفاء) اسی طرح سرانجام دے سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو خاتم النبیین کہہ کر، منصب نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی پانے کے منصب) کو تو ختم کر دیا لیکن جہاں تک منصب

رسول اللہؐ کے بعد

رسالت (یعنی وحی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل) کا تعلق تھا، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں رہنا۔ سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت کئی مرتبہ تمہارے سامنے آ چکی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا۔ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۳/۱۴۴)

اور محمدؐ اس کے سوا کیا ہیں کہ اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی اللہ کے رسول گذر چکے ہیں پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پا جائیں یا (کسی لڑائی میں) قتل کر دیئے جائیں، تو تم الٹے پاؤں (اپنے نظامِ کہن کی طرف) پلٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی (اس طرح) الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ (ان کے برعکس) جو لوگ (خدا کے اس دین کی) قدر سمجھیں گے، خدا انہیں اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

قرآن کریم کی اس قسم کی واضح اور بیّن ہدایات کے بعد، یہ کہنا کہ رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے، وحی کی رُو سے کرتے تھے (اور وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات پر ختم ہو گیا) اس امر کا اقرار اور اعلان ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد دین کا یہ سلسلہ علیٰ حالہٖ باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ جانشینانِ رسول اللہ (حضرات خلفائے کرامؓ) کے دل میں اس قسم کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی قرآن کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد رسول اللہ جو کچھ کرتے تھے، باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ اس لئے آپؐ کی وفات سے دین کے نظام میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے اس نظام کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا اور آگے چلایا۔ مملکت دن بدن وسیع ہوتی جاتی تھی اور اس کے

ساتھ اس کے تقاضے بڑھتے جاتے تھے۔ اس وجہ سے ہر دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے۔ ان امور کے

خلافتِ راشدہ میں

تصفیہ کے لئے وہ دیکھتے تھے کہ اگر کوئی پہلے کا فیصلہ ایسا ہے جس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تو وہ اسے علیٰ حالہٖ باقی رکھتے تھے۔ اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی تھی تو باہمی مشاورت سے اس میں تبدیلی کر لیتے تھے اور اگر کسی نئے فیصلے کی ضرورت ہوتی تھی تو اسی طرح باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے تھے۔ یہ سب کچھ قرآن کریم کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا اور اسی کو آپ کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباعِ سنت تھا۔ یعنی رسول اللہ نے جو طریق اختیار فرمایا تھا اس کا اتباع۔ ایک آئینی حکومت (CONSTITUTIONAL GOVT.) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان حضرات کو اس کا علم تھا کہ مستقل اور غیر تبدل قوانین و اقدار کا مجموعہ صرف اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس میں حالات کے تغیر سے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے

احادیث

کہ نہ نبی اکرمؐ نے اپنے فیصلوں (احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو دیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا۔ مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے حکم دے دیا تھا کہ آپؐ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھا جائے جس نے کچھ لکھا ہے وہ اسے مٹا ڈالے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ (رسول اللہ کی وفات کے بعد) لوگ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ کے پاس گئے اور آپ سے دریافت کیا کہ حضورؐ نے کیا چھوڑا ہے۔ آپ نے کہا کہ حضورؐ نے ما بین الدفتین (مجلد قرآن کریم) کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ

> رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہؐ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔ تو رسول اللہؐ سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے۔ اس کے حلال کئے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام سمجھو۔[1]

اسی طرح سیوطی نے تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک میں ایک روایت میں کہا ہے کہ

> حضرت عمرؓ نے احادیث کو لکھوانا چاہا اور اس بارے میں اصحابِ رسول اللہ سے مشورہ کیا تو عام صحابہؓ نے اس کا مشورہ دیا لیکن وہ ایک مہینہ تک خود غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن انہوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ میں نے، جیسا کہ تم لوگوں کو معلوم ہے تم سے تحریر احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ اور کتابیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کتابوں میں مشغول ہو گئے۔ اور

---

[1] بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی (علامہ محمد الخضری مرحوم) شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔ صفحہ ۱۲۱۔

کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ اس بنا پر خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو مخلوط نہ کروں گا۔ اس لئے انھوں نے تحریرِ احادیث کا کام چھوڑ دیا۔[1]

حتیٰ کہ حضرت علیؓ کے متعلق (امام بخاری کے حوالے سے) روایت ہے کہ

آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس بجز کتاب اللہ کے اور ان احادیث کے جو اس صحیفے میں درج ہیں، پڑھنے کی اور کوئی کتاب نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اس صحیفے کو کھولا تو اس میں (صرف چار حدیثیں درج تھیں جن میں سے ایک میں مختلف اونٹوں کے صدقات کا بیان تھا۔[2]

جب تک اسلامی مملکت کا یہ نظام قائم رہا (جسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے) تمام امور کے فیصلے اسی طریق پر ہوتے رہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یعنی قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و آئین کی چار دیواری میں رہتے ہوئے اپنے حالات کے مطابق مختلف امور کے فیصلے باہمی مشاورت سے۔ اس وقت تک انہی فیصلوں کی اطاعت "اللہ اور رسول" کی اطاعت سمجھی جاتی تھی یعنی کتاب اللہ کی اطاعت اس عملی نظامِ مملکت کی وساطت سے جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا۔ بعد میں جب یہ خلافت باقی نہ رہی

دورِ ملوکیت میں

اور دین اور سیاست میں تفریق پیدا ہو گئی تو "اللہ اور رسول" کی اطاعت کے ایک نئے مفہوم کی ضرورت پڑی۔ اللہ کی اطاعت کے متعلق سمجھ لیا گیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ باقی رہی رسول کی اطاعت تو اس کا ذریعہ سوائے احادیث رسول اللہ کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اب اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت نے دو مستقل (جداگانہ) اطاعتوں کی شکل اختیار کر لی۔ رسول کی اطاعت کو، اللہ کی اطاعت کی طرح مستقل اور غیر متبدل حیثیت دینے کے لئے، یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو قرآن کے اندر ہے اور دوسری احادیث کے مجموعوں میں۔ اوّل الذکر کا نام وحی متلو رکھا گیا اور ثانی الذکر کا وحی غیر متلو۔ یہ اصطلاحات اسی زمانہ کی وضع کردہ ہیں۔ رسول اللہ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع ہوا کہ حدیثِ رسول اللہ قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔ لہٰذا مستقل اور غیر متبدل حیثیت، احادیث کی رہ گئی۔

لیکن زمانے کے تقاضے اس قدر بڑھتے جا رہے تھے کہ نئے معاملات کے متعلق احادیث میں بھی فیصلے نہیں ملتے تھے۔ اس کے

فقہ

لئے ائمہ فقہ نے اجتہاد شروع کیا اور نئے نئے معاملات کے متعلق قرآن اور حدیث کی روشنی میں احکام مستنبط کرنے لگے لیکن رفتہ رفتہ ان کے ان اجتہادی فیصلوں (یعنی فقہ) نے بھی مستقل اور غیر متبدل پوزیشن اختیار کر لی اور قرآن و حدیث دونوں ان کے تابع ہو گئے۔ چنانچہ فقہائے حنفیہ کے مسلّم امام، ابوالحسن عبید اللہ الکرخیؒ نے یہ کہہ دیا کہ

---

[1] بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی (علامہ محمد الخضری مرحوم) شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڈھ صـ ۱۶۳۔

[2] تاریخ فقہ اسلامی صـ ۱۶۳۔ اس کتاب میں چاروں حدیثیں موجود ہیں۔

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے۔ (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۴۲۱۔)

یہی سلسلہ امت میں آج تک جاری ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ یہ صورتِ حالات کیوں پیدا ہوئی؟ فقط اس چیز کے باقی نہ رہنے سے جو الدین کی عمارت کی بنیاد تھی۔ یعنی خلافت علیٰ منہاجِ رسالت ـــــ جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں (مسلمانوں کی مملکت نہیں بلکہ اسلامی مملکت)۔ وہ مملکت جو اس نقشے پر قائم ہو جسے رسول اللہ نے مرتب فرمایا تھا۔ یعنی جس میں قرآن کریم کے غیر متبدل قوانین کی چار

پس چہ باید کرد؟ دیواری کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ معاملات کے فیصلے باہمی مشاورت سے طے پائیں۔ یہی وہ نظام ہے جس کے احیاء کے لئے میں کوشاں ہوں۔ جب یہ نظام قائم ہو گیا تو پھر نہ کوئی فرقہ باقی رہے گا اور نہ فقہ اور حدیث کے موجودہ جھگڑے۔ اس لئے کہ یہ تمام فرقے اور جھگڑے، دین (نظام مملکت) کے انفرادی مذہب بن جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں ـــــ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں فرقے نہ ہوں۔ لہٰذا جب تک اسلام بھی "مذہب" رہے گا اس وقت تک فرقے بھی موجود رہیں گے ـــ جب یہ الدین میں تبدیل ہو جائے گا تو پھر امت میں وہی وحدت پیدا ہو جائے گی جو اُس زمانے میں موجود تھی جب یہ الدین کی شکل میں متشکل تھا۔ اُس وقت اُمت وہی فرائض انجام دے گی جو رسول اللہ سرانجام دیتے تھے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ایک مقام پر رسول اللہ کا فریضہ یہ بتایا گیا ہے کہ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۷) "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے"۔ اور دوسری جگہ یہی فریضہ امّت کا بتایا گیا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹)۔ "تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم لوگوں کو معروف کا حکم دیتے ہو۔ اور منکر سے روکتے ہو"۔ اس لئے کہ ختم نبوت کے بعد، اسی امت کو وارث قرار دیا گیا ہے (۳۵/۳۲)۔ اس کتاب کی وارث امت کو فرائضِ رسالت سرانجام دینے ہوں گے۔ جب یہ ان فرائض کو سرانجام دے گی، اسلام پھر اپنی حقیقی شکل میں سامنے آجائے گا۔

والسلام

پرویز

آئندہ شمارے میں

"قرآن کا نظامِ حکومت" کے عنوان سے ایک نہایت اہم مقالہ شائع ہو رہا ہے۔ اس کا الگ پمفلٹ (اردو اور انگریزی دونوں میں) شائع ہوگا۔ قارئین ابھی سے اپنے آرڈر بک کرالیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

زکوٰۃ

حال ہی میں، محترم شعیب صاحب، وزیر مالیات، حکومت پاکستان نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ زکوٰۃ کو حکومت کے ٹیکس سے الگ رکھا جائے گا کیونکہ یہ ایک مذہبی فریضہ ہے۔ اس پر بعض اخبارات میں یہ بحث شروع ہو گئی ہے کہ محترم موصوف کا یہ خیال اسلامی نقطۂ نگاہ سے کیسا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں کئی ایک استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ طلوع اسلام میں زکوٰۃ کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی جائے۔

سنہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے، حکومت پاکستان نے ایک زکوٰۃ کمیٹی بدیں غرض مقرر کی تھی کہ وہ زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کی وصولی اور خرچ سے متعلق مسائل پر تحقیق کے بعد اپنی سفارشات پیش کرے۔ اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس کا جواب پرویز صاحب نے بھی بھیجا تھا۔ یہ جواب اُسی زمانہ میں طلوع اسلام میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ چونکہ یہ نو دس برس اُدھر کی بات ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس جواب کو دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ جن احباب نے اپنے استفسارات بھیجے ہیں، وہ اور ان کے علاوہ دیگر قارئین جنہوں نے سنہ ۱۹۵۰ء میں اس مضمون کو نہیں دیکھا، اس سے استفادہ کر سکیں۔ وہ مضمون بالتصرف درج ذیل ہے۔ (طلوع اسلام)

زکوٰۃ ——— ایک اہم اور اصولی بحث

(پرویز)

حکومت پاکستان نے ایک زکوٰۃ کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ وہ زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کے مسئلہ پر غور و تحقیق کرے۔ اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے جو زکوٰۃ کی جزئیات سے متعلق بہت سے امور پر مشتمل ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی تعریف کیا ہے؟ کن کن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ زکوٰۃ کس طرح ادا کرنی چاہیئے؟ زکوٰۃ کی رقم کن مصارف میں خرچ ہونی چاہیئے؟ کیا موجودہ حالات کے پیش نظر نصاب اور زکوٰۃ کی

شرح میں تبدیلی ہو سکتی ہے ؟ وغیرہ۔ سکریٹری زکوٰۃ کمیٹی نے یہ سوالنامہ میرے پاس بھی بھیجا ہے کہ میں امور مستفسرہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ میں نے اس سوالنامہ کے جواب میں جو "یادداشت" سکریٹری زکوٰۃ کمیٹی کو بھیجی ہے اسے طلوع اسلام میں شائع کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں ایسے نکات آ گئے ہیں جو اس مسئلہ پر ایک خصوصی انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ سوالنامہ اور اس کا جواب انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس کا آزاد ترجمہ بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ کمیٹی کی تشکیل، اس کے ذمہ عائد کردہ فرائض اور سوالنامہ کی تفاصیل سے مترشح ہوتا ہے کہ حکومت کا غالباً یہ خیال ہے کہ اس کے ذمہ مملکتِ پاکستان کی رعایا کے صرف "دنیاوی امور" کا انصرام ہے جس کے لئے وہ مختلف مدات سے اپنی آمدنی حاصل کرتی ہے اور اس آمدنی کو اپنی صوابدید کے مطابق مناسب مقامات پر خرچ کرتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے "مذہبی امور" ہیں جو حکومت کے دائرۂ عمل و نفوذ سے باہر ہیں۔ ان امور کے لئے "مذہب" نے ایک خاص ذریعہ آمدنی متعین کیا ہے جسے زکوٰۃ کہتے ہیں اور اس مد سے حاصل شدہ آمدنی کو مذہبی امور پر ہی صرف کیا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت کے ذہن میں کچھ اس قسم کا تصور ہے تو معاف فرمایئے یہ تصور بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اور قرآن کے منشا کے یکسر خلاف۔ قرآن "دنیاوی امور" و "مذہبی امور" میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو مذہب[1] نہیں دیا۔ دین عطا فرمایا ہے۔ اور دین کے معنی آج کی اصطلاح میں نظامِ معاشرت (SOCIAL ORDER) یا نظامِ مملکت (SYSTEM OF STATE) ہیں۔ قرآن توحید سکھاتا ہے۔ جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کی موجودہ اور آنے والی زندگی سے متعلق قوانین کا سرچشمہ ایک ہے۔ لہٰذا ان میں تفریق، ثنویت پر مبنی ہے۔

اسلام میں ثنویت نہیں

جو قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ بنا بریں دین، اسلامی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور اس میں "قیصر اور خدا" کے حصوں کی تفریق زمانہ قبل از اسلام کے مذہبی تصور کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام اس تفریق کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی تو انھوں نے "قیصر اور خدا" کی مملکتوں کو پھر سے الگ کر دیا۔ دنیا اور مذہب کی یہ ثنویت (DUALISM) اُس وقت سے آج تک مسلمانوں میں چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی عام طور پر مذہب کے نام سے جو کچھ کیا جا رہا ہے یا جو کچھ کرنے کے ارادے ظاہر کئے جا رہے ہیں وہ بھی اسی تفریقی مسلک کے شواہد ہیں۔ لہٰذا جب تک اس ثنویت کو ذہنوں سے دور نہیں کیا جائے گا نہ تو اسلام کے متعلق صحیح تصور قائم ہو سکے گا اور نہ ہی ہماری عملی دنیا میں صحیح اسلامی قوانین رائج ہو سکیں گے۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب دین سے متعلق قرآن کے اس صحیح تصور کو سامنے رکھا جائے۔ لہٰذا زکوٰۃ کی قرآنی تشریح سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دین کا بنیادی تصور سامنے لایا جائے۔

دین کیا ہے ؟

دین کا بنیادی تصور یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی رُو سے ہر فردِ انسانی کے لئے اس

---

[1] اہلِ مغرب قرآنی زندگی سے واقف نہیں تھے اس لئے انھوں نے اسلام کے لئے بھی (RELIGION) کا لفظ اختیار کیا لیکن اس میں ان کا بھی کیا قصور ہے جب ہم نے خود اسلام کو مذہب کے نام سے تعبیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "اسبابِ زوالِ امت")

کی مضمر صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشوونما پانے کے مواقع یکساں طور پر موجود ہوں۔ اس نظام کو قرآنی مفہوم میں نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے اور جو وحدتِ خالق اور وحدتِ مخلوق کے محکم اصول پر مبنی ہے۔ چونکہ اس قسم کا نظامِ ربوبیت قائم نہیں ہو سکتا جب تک رزق کے سرچشمے اس جماعت کے ہاتھ میں نہ ہوں جو اس قرآنی نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے۔ اس لئے اس جماعت کے لئے تمکن فی الارض ناگزیر ہے۔ یہی وہ منشا اور غایت ہے جس کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت وجود میں آئے۔ یعنی اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے دائرہ حفاظت میں بسنے والے تمام انسانوں کی ربوبیت (یعنی ان کی تمام مضمر صلاحیتوں کے بردمند ہونے) کے لئے پورے پورے اسباب و ذرائع مہیا کرے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جسے قرآن نے اسلامی حکومت کے لئے بطور اساس متعین کر دیا ہے۔ اور جس میں زمان و مکان کی تبدیلی سے کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اس اصول کو عملی طور پر کیسے متشکل کیا جائے گا؟ اس کا تعلق زمان اور مکان کے بدلنے والے حالات سے ہے یعنی ہر زمانے کے مسلمان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس اصولی مقصد کے حصول کے لئے عملی جزئیات خود متعین کریں گے۔ قرآن کا اسلوبِ ہدایت یہ ہے کہ اس نے (بجز چند مستثنیات) اسلامی نظام کے لئے صرف اصول متعین کئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ اس لئے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس کے اصول محکم اساس پر مبنی ہیں جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات مختلف حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان بدلنے والی جزئیات کو عام اصطلاح میں شریعت کہا جاتا ہے۔

شریعت کسے کہتے ہیں؟

اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ شریعت کسی جامد یا غیر متبدل مجموعۂ قوانین کا نام نہیں، بلکہ ہر وہ مجموعہ قوانین (یعنی قرآنی اصولوں کے تابع مدون کردہ جزئیات) جو کسی ایک زمانے کی قرآنی حکومت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی روشنی میں مدون کرے اس نظامِ حکومت کی شریعت کہلائے گا۔ ان جزئیات کے مدون کرنے میں ہر زمانے کی اسلامی حکومت ان جزئیات سے مدد لے سکتی ہے جو اس سے پہلے دور کی کسی اسلامی حکومت نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مدون کی تھیں۔ یعنی سابقہ دور کی شریعت، بعد کے دور کی اسلامی حکومت کے لئے بطور نظائر (PRECEDENTS) کام دے گی۔

قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلی حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے حقہ نے۔ اس اسلامی حکومت نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی جزئیات خود متعین کیں۔ اگر یہ سلسلۂ خلافت اسی طرح قائم رہتا تو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ قائم رہتا۔ لیکن وہ دور جلد ختم ہو گیا اور اس کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی۔ جس میں رفتہ رفتہ امورِ دنیاوی کو حکومت نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور "مذہبی امور" کو ارباب مذہب کے سپرد کر دیا۔ ان حکومتوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے قوانین مرتب کرائے۔ اور یہ قوانین اس وقت کے لئے شریعتِ اسلامی قرار پائے۔ لیکن دین کو دنیا سے الگ کر دینے سے نظامِ اسلامی کی اصل میں خرابی آ گئی اور ایسے قوانین بھی مرتب ہوئے شروع ہو گئے جو قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف تھے۔ اب مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں وہ امورِ سلطنت سے متعلق اپنی منشا کے مطابق قوانین مرتب کرتی ہیں لیکن "امورِ مذہب سے متعلق (جسے PARSONAL LAW کہا جاتا ہے) مفتیوں سے فتاویٰ لے لئے جاتے ہیں۔ اور جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں، وہاں یہی فتاویٰ انفرادی طور پر صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آج ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی منشا کے مطابق

شریعت کا نفاذ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے دَور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود متعین کریں۔ یہی قوانینِ شریعتِ اسلامی کہلائیں گے نہ کہ وہ قوانین جو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کسی سابقہ اسلامی حکومت نے وضع کئے تھے۔

اس پس منظر کی روشنی میں اب زکوٰۃ کے اہم مسئلہ پر غور کیجئے۔ قرآن نے ان اسباب و ذرائع کو جن کی مدد سے اسلامی حکومت نوعِ انسان کی ربوبیت کا انتظام کرے گی۔ زکوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:-

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (۲۲/۴۱)

وہ لوگ کہ جنہیں جس وقت ہم زمین میں حکومت عطا کریں گے تو ان کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہوگا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴) یعنی ان کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ زکوٰۃ کے لئے جدوجہد کریں گے۔ (فاعلون) اگر سورۂ حج کی مندرجہ بالا آیت (۲۲/۴۱) کے معنی یہ لئے جائیں کہ جب ان لوگوں کی اپنی حکومت ہو جائے گی تو یہ آمدنی کا اڑھائی فیصد حصہ خیرات کے کاموں میں صرف کیا کریں گے تو یہ بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اپنی آمدنی سے ۲½ فیصد حصہ خیرات کے کاموں میں صرف کرنے کے لئے اپنی حکومت کی کیا ضرورت ہے؟ یہ خیرات تو ہم ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی کے زمانہ میں بھی بلا روک ٹوک کیا کرتے تھے۔ اس آیہ جلیلہ کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ غیر قرآنی حکومت میں مقصود اپنا نفع ہوتا ہے لیکن قرآنی حکومت میں مقصدِ پیشِ نظر نوعِ انسانی کی نشوونما (زکوٰۃ) ہوتا ہے۔

اس آیت میں "اقامتِ صلوٰۃ" اور "ایتائے زکوٰۃ" اکٹھا آیا ہے۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم میں یہ دونوں چیزیں عام طور پر اکٹھی بیان ہوئی ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہمی تعلق کیا ہے[1] اور اقامتِ صلوٰۃ سے کیا مفہوم ہے۔ یہ چیزیں اس وقت میرے موضوع سے خارج ہیں۔ سردست آپ زکوٰۃ کے متعلق ہی دیکھئے۔ لفظ زکوٰۃ کا مادہ زکا ہے جس کے معنی نشوونما (GROWTH) کے ہیں۔ "ایتائے زکوٰۃ" (یعنی زکوٰۃ بہم پہنچانے) کے معنی ہوئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ بنابریں "زکوٰۃ" سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے اسلامی حکومت نوعِ انسانی کے تزکیہ (GROWTH) یا ربوبیت (DEVELOPMENT) کا انتظام کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی حکومت کا کام افرادِ ملت کو زکوٰۃ (سامانِ نشوونما) دینا ہوگا۔ ان سے زکوٰۃ لینا نہیں ہوگا۔ لیکن ایتائے زکوٰۃ (سامانِ نشوونما دینے کے لئے) حکومت کو آمدنی (REVENUES) کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے اسلامی حکومت کی تمام آمدنی اذرائع زکوٰۃ بن جائے گی۔ اور اس آمدنی سے نظامِ ربوبیت قائم کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے ملت کا ہر فرد "ایتائے زکوٰۃ" کے فریضہ کی

---

[1] صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے باہمی تعلق کے لئے سورۂ ہود کی اس آیت کو دیکھئے جس میں قومِ شعیبؑ نے حضرت شعیبؑ سے کہا تھا کہ کیا تمہاری صلوٰۃ ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے اموال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکیں۔ (۱۱/۸۷) دیکھئے نظامِ صلوٰۃ کس طرح معاشی نظام کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

ادائیگی میں شریک ہو جائے گا۔[1] (یہ نظامِ ربوبیت کس طرح قائم کیا جائے گا، یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور مسئلہ پیشِ نظر کی حدود سے باہر۔ اس لئے میں سردست اپنے آپ کو زکوٰۃ تک ہی محدود رکھتا ہوں۔ اگر حکومت نے اس کی ضرورت سمجھی تو اس نظام کی قرآنی تفاصیل بھی پیش کی جا سکیں گی) قرآن نے زکوٰۃ کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے لیکن اس کی تفاصیل کو کہیں متعین نہیں کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس اصولی نظام کی روشنی میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان تفاصیل کے متعین کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ زکوٰۃ کا اصول غیر متبدل ہے۔ لیکن اس کی جزئیات ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ لہٰذا آج جو اسلامی حکومت نظامِ ربوبیت کو قائم کرنا چاہے وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی مداتِ آمدنی کی جزئیات خود متعین کرے گی۔ اور اس طرح حاصل کردہ آمدنی کو ملت کی نشوونما (زکوٰۃ) پر صرف کرے گی۔ یہ جزئیات حکومت کی طرف سے عائد کردہ ہر شرح نصاب، طریقِ وصولی نیز اس آمدنی کے مناسب محلاتِ اخراجات وغیرہ سب کو محیط ہوں گی۔ ہم ان جزئیات کی تعیین میں ان جزئیات سے بطور نظائر مدد لیں گے جو اس سے پہلے کسی اسلامی حکومت نے اپنے دور کے لئے متعین کی تھیں۔ اس طرح ہماری متعین کردہ جزئیات ہماری شریعت بن جائیں گی۔ بشرطیکہ ان کی اساس قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر ہو۔ لیکن اگر یہی آمدنی قرآنی منشا کے خلاف وصول کی جائے یا اسے نظامِ ربوبیت کے خلاف مقاصد میں صرف کیا جائے تو یہ سب کچھ غیر شرعی ہو جائے گا۔

صدقات قرآن نے زکوٰۃ کے علاوہ ایک اصطلاح "صدقات" کی بھی استعمال کی ہے اور اس کے لئے اس نے خرچ کی مدات کا بھی ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ (۹/۶۰)

صدقات کا مصرف یہ ہے کہ وہ فقراء اور مساکین کو دیئے جائیں اور ان لوگوں کو جو تحصیلِ صدقات میں کام کریں اور جن کے قلوب کی تالیف مقصود ہو۔ نیز قیدیوں اور غلاموں کو رہا کرنے میں۔ اور تاوان زدہ (یا مقروض) لوگوں کا تاوان (یا قرض) ادا کرنے میں۔ اور اللہ کی راہ میں۔ اور اجنبی مسافروں کے لئے۔

میں اس وقت ان مختلف مدات کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ جن جن ضروریات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ ایسی ہیں جو ہنگامی حوادث یا اتفاقی حالات کے ماتحت پیدا ہوتی ہیں۔ اور اسلامی سوسائٹی (جس کا فریضہ ہی ربوبیتِ عامہ ہے) کی مستقل ضروریات قرار نہیں پا سکتیں۔ مثلاً جیسے اس وقت پاکستان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ درپیش ہے یا کسی علاقے میں سیلاب زدگان کی امداد کا سوال سامنے آجاتا ہے۔ ایسی ہنگامی اور غیر متوقع (UNFORESEEN) ضروریات کے لئے حکومت کے مستقل بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوا کرتی۔ اس قسم کی ہنگامی ضروریات ہنگامی ٹیکس کے ذریعے

---

[1] اس لئے کہ اسلامی حکومت تمام امت کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے کسی خاص گروہ یا فرد کی نہیں ہوتی۔

پوری کی جایا کرتی ہیں یا لوگوں کے عطیات سے۔ ہمارے ہاں صدقہ کسی بڑی مصیبت کے ٹلنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ عربوں میں عطیات کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات میں عطیات بھی شامل ہیں، اس لئے کہ اس نے صدقات کو علانیہ طور پر دینے کا بھی ذکر کیا ہے اور چپکے سے بھی (۲/۲۷۱)۔ نیز یہ بھی کہا ہے کہ اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور جن کی مدد کی گئی ہے ان کی دل آزاری کر کے تخریب (باطل) کا ذریعہ نہ بناؤ۔ (۲/۲۶۴) یہ صدقات کی انفرادی شکل ہوگی۔ جب یہ صدقات ٹیکس یا عطیات کی صورت میں ہوں تو ان کو وصول کرنا اور خرچ کرنا اجتماعی کام ہوگا جس کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ صدقات کے وصول کرنے کا واضح حکم قرآن میں موجود ہے (۹/۱۰۳) اور حکومت ہی کو اس کے صرف کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے (۹/۶۰)۔ اس قسم کے ہنگامی ٹیکس کی شرح کیا ہونی چاہیئے؟ یا عطیات کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟ قرآن اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس کی کوئی حدبندی کی جا سکتی ہے۔ مصارف

فی سبیل اللہ کا مفہوم

کی فہرست میں البتہ قرآن نے بعض مدات کو گنا دیا ہے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) اور باقیوں کی طرف "فی سبیل اللہ" سے اصولی اشارہ کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن، ملت کے اجتماعی امور کے متعلق "فی سبیل اللہ" کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا مصارفِ صدقات میں مختلف مدات کے ساتھ "فی سبیل اللہ" کے اضافے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جن مدات کا ذکر کیا گیا ہے ان جیسی اور مدات جو ملت کی اس قسم کی ہنگامی ضروریات کے لئے ناگزیر ہو جائیں، ان میں شامل ہیں۔ اس مقام پر قرآنی تعلیم سے متعلق ایک اور اہم نکتہ کی طرف اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اسے شرح و بسط سے بیان کیا جاتا۔ لیکن یہ مقام صراحت و وضاحت کا نہیں اس لئے یہاں اس کا ذکر صرف اشارۃً کیا جا سکے گا۔ قرآنی احکام کا اسلوب یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ارتقائی مدارج کے ساتھ موافقت اور مطابقت رکھتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً جب رسول اللہ نے دعوتِ اسلام کی ابتدا کی ہے، تو اس وقت اسلامی حکومت وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس لئے اس زمانے کے احکام اس انداز کے تھے جو کسی ایسی سوسائٹی (معاشرہ) میں نافذ العمل ہو سکیں جن میں ہنوز اپنی حکومت قائم نہ ہو سکی ہو۔ حضورؐ کی دعوت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اس مقام تک پہنچ گئی جہاں ملتِ اسلامیہ نے اپنا نظامِ حکومت خود قائم کر لیا۔ یہ نظام اس سوسائٹی کے معاشرتی ارتقاء کی آخری کڑی تھی۔ لہٰذا اس مقام پر ضروری احکام دینے کے بعد دین کی تکمیل ہو گئی۔ قرآن ان تمام احکام کا مجموعہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس میں (مثلاً) صدقات کے متعلق انفرادی احکام بھی ملتے ہیں اور حکومتی نظام کے اندر کے احکام بھی۔ حتیٰ کہ ایسے احکام بھی جن میں حکومت کو کسی قسم کے ٹیکسوں یا عطیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔[1]

تدریجی ارتقاء

جن لوگوں کی نگاہ سے قرآنی احکام کا یہ اسلوب اوجھل ہو گیا، وہ مختلف احکام کے "تضاد" سے گھبرا اٹھے اور اس مشکل کے حل کے لئے انھوں نے "نسخِ آیات" کا عقیدہ قائم کر لیا۔ یعنی انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو احکام بعد کے ارتقائی مدارج سے متعلق نازل ہوئے تھے انھوں نے ابتدائی مراحل سے متعلق نازل شدہ احکام کو

---

[1] جب قرآنی معاشرہ اپنی مکمل شکل میں قائم ہو جاتا ہے، اس وقت تمام ذرائعِ آمدنی مملکت کی تحویل میں ہوتے ہیں جن سے وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اس وقت فاضلہ دولت بھی کسی کے پاس نہیں رہتی۔ اس لئے اس وقت ٹیکس یا عطیات وصول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

منسوخ کر دیا ہے۔ اگر ان حضرات کے سامنے قرآنی احکام کا وہ اسلوب ہوتا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو انھیں کوئی ایسی مشکل پیش نہ آتی جس کے لئے "ناسخ و منسوخ" کا غیر قرآنی عقیدہ وضع کرنا پڑا۔ قرآن کی اہمیت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کی ہر ارتقائی حالت سے متعلق مناسب احکام اپنے اندر رکھتا ہے۔ جو معاشرہ (سوسائٹی) جس وقت اپنے آپ کو قرآنی نظام کے تابع لانا چاہے وہ قرآن میں اس وقت کے ارتقائی مقام کے مناسب احکام موجود پائے گا۔ مثلاً ہم تقسیم ہند سے پہلے اپنے معاشرتی ارتقاء میں جس مقام پر تھے قرآن ہمیں اس سے آگے بڑھنے کے اصول دیتا تھا۔ تقسیم کے بعد ہم جس حالت میں ہیں، اس کے لئے بھی اس کے پاس ہدایت موجود ہے۔ اور اس کے بعد اگر ہم نے اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے تابع لانے کا فیصلہ کر لیا تو اس کے لئے بھی قرآن کے پاس ہدایت موجود ہے۔ اس لحاظ سے قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور جس مقام سے کوئی سوسائٹی اپنے آپ کو قرآن کے تابع لائے قرآن اسے اس مقام سے آگے جانے کے لئے واضح روشنی عطا کر دیتا ہے اور کوئی مقام ایسا نہیں جہاں پہونچ کر وہ یہ کہہ دے کہ اب میں ہدایت دینے سے قاصر ہوں۔

ماحصل

زکوٰۃ و صدقات سے متعلق تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کی رُو سے۔

(۱) زکوٰۃ ان بنیادی مقاصد میں سے ہے جن کے لئے اسلامی حکومت کا قیام وجود میں آتا ہے۔

(۲) اسی لئے زکوٰۃ سے مقصود ہے ایسا نظام قائم کرنا جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا سامان موجود ہو۔

(۳) قرآنی حکومت کے تمام ذرائع آمدنی زکوٰۃ ہی کے مدات ہوں گے۔

(۴) قرآن نے ان مدات کی تفاصیل متعین نہیں کیں۔ ہر حکومت اپنی ضروریات کے مطابق انھیں خود متعین کرے گی۔

(۵) بعض ہنگامی اور غیر متوقع ضروریات کے لئے جو کچھ وقتی طور پر وصول کیا جائے گا اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقات کہا جاتا ہے۔

(۶) صدقات ہنگامی ٹیکس یا عطیات پر مشتمل ہو سکتے ہیں

(۷) صدقات کی شرح کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں البتہ ان کی مدات خرچ کی ایک فہرست قرآن نے دی ہے جس میں "فی سبیل اللہ" کی تشریح کے مطابق اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

(۸) صدقات کی تحصیل اور صرف کا انتظام بھی حکومت ہی کے ذمہ ہو گا اور اس کے لئے جو عملہ متعین کیا جائے گا اس کے اخراجات اس مد سے لئے جائیں گے۔

(۹) صدقات (ٹیکس) کی ضرورت اس وقت تک ہو گی جب تک نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا۔

یہ ہے میرے فہم قرآن کے مطابق مختصر الفاظ میں زکوٰۃ اور صدقات سے متعلق قرآن کی تعلیم کا حاصل۔ ہمارے مروجہ الجھاؤ کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زکوٰۃ اور صدقات کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے اور صدقات سے متعلق احکام و تفاصیل کو زکوٰۃ کے احکام قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے نہایت وضاحت سے ان دو الفاظ کو الگ الگ استعمال کیا ہے۔ اگر صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی ہوتی تو وہ صدقات کی جگہ زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کرتا۔ لیکن قرآن میں غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک زکوٰۃ کا تصور صدقات سے الگ ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ابتدائی مدارج میں (جب ہنوز اپنی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی) "صدقات" کا عمومی مفہوم "خیرات" ہی تھا لیکن جب بعد میں اپنا

(باقی صـ ۵۳ پر)

سرسیّد احمد خاںؒ

(۳)

بانگِ رحیل — کاروانِ فکر و اجتہاد کیلئے

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی

(از: محترم صفدر سلیمی صاحب)

قوموں کی تاریخ مسلسل اور پیہم انقلابات کی ایک داستانِ دراز ہے۔ اور خضرِ راہ کا مقام رکھتے ہیں وہ رہنمایانِ عظام جنہوں نے ان انقلابات میں امامت کا فریضہ ادا کیا۔ یہ سب کچھ درست ہے لیکن ایک سالارِ انقلاب کی عظمت کا ممتاز اور موثر ترین پہلو ہمیشہ یہی رہا کہ اس نے اپنی قوم کے تصورات میں کس قدر تبدیلی پیدا کی۔ اس کے ذہنی جمود کے تاریک گوشوں کو کیسی تب و تاب اور ذوق و شوق سے آشنا کیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ندرتِ فکر و عمل سے اس کے افکار کو کس قدر زندگی، روشنی اور توانائی عطا کی۔ لاریب کہ ایک سپہ سالارِ جنگی کارناموں سے اپنی قوم کے سر فتوحات کے سہرے باندھ سکتا ہے بے شک ایک سیاسی زعیم اپنے تدبر اور فراست سے ملت کی سربلندی اور عظمت و شہرت کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ ان معرکہ آرائیوں اور کامرانیوں کی اہمیت سر آنکھوں پر۔ لیکن یہ بھی تو یاد رکھیے کہ جنگی فتوحات کے قصرِ مشید کو مخالفین کی قوتِ بازو کھنڈرات میں بدل سکتی ہے۔ بلحاظ سیاست کی ہر کامیابی بھروں کی گردش سے خاک میں ملائی جا سکتی ہے۔ لیکن قوتِ بازو کی تمام معجز نمائیاں اور تدبر کی فسوں کاریاں مل کر بھی اس قوم کو شکست نہیں دے سکتیں جس کے فکر و عمل کی توانائیاں ایک داعیٔ انقلاب نے شعوری انقلاب کے آبِ حیات سے پروان چڑھائی ہوں۔ اقبالؒ نے کس قدر درست کہا ہے۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
اور — ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

آج جب سرسید کی انقلاب آفریں شخصیت کے مختلف گوشے ہمارے لئے (انتہائی) جاذبِ دلنظر کا سامان بنتے ہیں تو پولیٹیکل کردار کی عظمت کے ساتھ اس کی زندگی کا وہ تابناک پہلو بھی پوری درخشندگی کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے جو ملت کے فکرواجتہاد کے باب کے افتتاح کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں ہم اُسے فکروبصیرت کے ان دروازوں کو پوری جراٴت وبے باکی سے کھولتا پاتے ہیں جو صدیوں سے بند پڑے تھے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر سرسید کی جراٴت وفراست اس "علمی وفکری معرکہ آرائی" کے لئے مردانہ وار آگے نہ بڑھتی تو نہ صرف یہ کہ سرسید امام انقلاب کے ممتاز ترین مقام سے محروم رہ جاتے بلکہ اپنے ایوانِ انقلاب کی تعمیر نو میں ثباتِ دوام کی جو جھلک ہم آج دیکھ رہے ہیں ناپید ہوتی۔ اقبالؔ کے الفاظ میں

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

سرسید نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ان کے مذہبی احساسات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اور ان کے فکروعمل کی تمام سرگرمیاں اسی کے محور پر گردش کرتی ہیں۔ اس کی دوربین نگاہوں نے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ جن مذہبی عقائد کو یہ درجہ حاصل ہے وہ صدیوں کی عجمی دستبرد سے متاثر ہو کر کس قسم کی معجونِ مرکب بن چکے ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ ہمارے سیاسی انقلاب اور قومی استقلال کا نقیب تھا وہاں وہ قوم کے فکری جمود اور ذہنی شکست کے ظلمت کدہ میں فکرِ تازہ کی مشعلیں لئے نمودار ہوا۔ ملوکیت کی مفاد پرستیوں نے مذہبی اجارہ داروں کی سازش سے بابِ اجتہاد پر صدیوں سے کڑے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ اور اس سازش کے لئے "خدائی سند" پیدا کر کے "خود ساختہ جانشینانِ رسولؐ" نے مسلکِ تقلید کی برفانی سلوں سے امت کے ذہنی اور فکری ارتقاء کو منجمد اور مفلوج کر رکھا تھا۔ فکروبصیرت کی آزادی جس کا مژدۂ جانفزا احکمِ نوعِ انسانی کو حضور رسالتمآبؐ نے وحی کی زبان سے سنایا تھا اور جس کی نشوونما خلفائے راشدینؓ نے فریضۂ دین کی حیثیت سے کی تھی اب ایسا جرمِ عظیم قرار پاچکی تھی جو کفروارتداد کے ہم پایہ اور قابلِ تعزیر تھا۔ کتنے ہی مبارک وجود مفکرینِ دین اس "آزادیٴ اجتہاد" کے جرم میں تختۂ دار تک پہنچا دیئے گئے۔

آج جبکہ تقاضائے وقت کی حرارتوں نے مذہبی اجارہ داری اور مسلکِ تقلید کی ان برفانی سلوں کو پگھلا کر رکھ دیا ہے اور طلسم سامری کے یہ بندھن ٹوٹ چکے ہیں شاید سرسید کی اُس جراٴت وعزیمت کا کماحقہٗ اندازہ نہ لگایا جاسکے جو اس معرکہ آرائی میں بروئے کار آئی۔ سرسید نے وقت کے تقاضوں کی پکار کو سنا۔ ملت کی نفسیات کو جانچا۔ فریضۂ ملی کا احساس کیا۔ اور پھر وہ ندرتِ فکرونظر کا چراغ ہاتھوں میں لئے بابِ اجتہاد کا فاتح بن کر حکمتِ دین کی بارگاہ میں داخل ہو گیا۔ حریمِ مذہب کی مسندوں سے غیض وغضب کی آندھیاں اٹھیں لیکن اُسی ہوائے تند وتیز میں یہ مردِ درویش اپنا چراغ جلاتا اور تاریک گوشوں کو منور کرتا چلا گیا۔ اور یہ کہتے ہوئے اُس نے فقیہانِ حرم کے چہروں سے تقدس کے مصنوعی نقاب الٹ دیئے کہ

عشق ومستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
اور — ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار

اُس نے اپنی ملت کو یہ نشانِ راہ عطا کیا کہ دینِ خداوندی نے فکرواجتہاد کی جو راہ پہلے دن سے قائم کی تھی اُسے بند کرنے کا حق نہ کسی دَور

کی ملوکیت کے "ظل اللہ" کو ہے اور نہ کسی مفتی و ملا کو۔ یہ دروازے رسول خدا کے مقدس ہاتھوں سے امت کے لئے کھولے گئے۔ اور فکر و بصیرت کی ان راہوں پر چلنا نہ صرف افرادِ امت کا دینی حق ہے بلکہ فریضہ بھی۔ اس معاملہ میں سرسید کے جذبۂ خلوص اور عزم صمیم کا اندازہ لگانے کے لئے ان کے ایک اہم مضمون کے اس اقتباس پر غور کیجئے جو انہوں نے مخالفتوں کے بے پناہ ہجوم میں "حالِ خود و یارانِ خود" کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ہمیں ملحد و زندیق اور لامذہب کہنا ہمارے لئے قطعاً باعثِ تعجب نہیں کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد و ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم و رواج اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبرِ آخر الزماں محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے۔ اور ہم اُس جھوٹے خدا، فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسا ہمارے جدِ امجد ابراہیم (علیہ السلام) اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد و ذوالجلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لوگ ہمیں ملحد و زندیق اور لامذہب نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ کیونکہ ہم ان کے خداؤں پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔ (حیاتِ جاوید)

پیشتر اس کے کہ ہم سرسید اور مذہبی طبقہ کی باہمی آویزش کے چند ایک گوشوں کو سامنے لائیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دین کے ان اہم معاملات میں سرسید کے نقطۂ نگاہ اور ندرتِ فکر کو پیش کیا جائے جو مسلمانوں کی زندگی اور عصرِ حاضر کے تقاضوں سے گہری نسبت رکھتے ہیں۔ تاکہ یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آسکے کہ سرسید نے ان مسائل کی کیا تعبیر کی اور اس معاملہ میں مولوی حضرات کی تند و تیز مخالفت اور تکفیر کے فتووں کی حقیقت کیا تھی؟ ہم واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سرسید کی یہ تجدیدِ فکر نہ تو سہو و خطا سے یکسر پاک ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اور نہ اسے حرفِ آخر کا مقام دیا جاسکتا ہے۔ یہ درجہ تو صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے اور بس۔ خود سرسید نے بھی یہ کبھی گوارا نہیں کیا کہ انہیں مذہبی پیشوا کا درجہ دیا جائے یا ان کے افکار کو غلطی سے پاک سمجھ کر ان کی اطاعت کی جائے۔ چنانچہ لاہور کی ایک تقریر میں انھوں نے واضح طور پر یہ اعلان کیا۔

> میں رسولوں کے سوا کسی کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دینی اور روحانی امور سے متعلق ہیں اور جس کو مذہب کہتے ہیں وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسولِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کا ازلی مذہب خدا ابدالآباد تک قائم رکھے (اور ضرور قائم رکھے گا کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی بھی ہے) ختم ہوگیا۔ (حیاتِ جاوید)

اصل سوال تھا دین کے معاملہ میں تجدیدِ فکر و اجتہاد کا حق۔ سرسید نے نہ صرف اس حق کا استعمال ضروری سمجھا بلکہ اسے ملت کی نشاۃِ ثانیہ کی اساس بھی قرار دیا۔ آیئے اب اس کی ان فکری و اجتہادی کاوشوں کا جائزہ لیں۔

فکر و اجتہاد کی ضرورت

سرسید دین کے معاملہ میں ایمان علیٰ وجہ البصیرت کا قائل تھا۔ اور مسلکِ تقلید کا شدید ترین مخالف۔

نواب محسن الملک کے نام اس کے ایک مکتوب سے اس نقطۂ نظر کا اندازہ لگائیے جس میں اُس نے لکھا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا اتنا کسی اور چیز نے نہیں پہنچایا۔ تقلید اسلام کے حق میں سنکھیا سے بھی زیادہ زہرِ قاتل ہے۔ بلاشبہ ہم نے علماء کو مثلِ یہود و نصاریٰ ارباباً من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔ خدا سب کو اس گناہ سے بچائے۔

نواب صاحب موصوف کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا، تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقیناً مذہب کو چھوڑ دیتا...... مذہب اسلام میرے نزدیک آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے۔ وہ کوئی معمایا بدر چاچ کا شعر نہیں جس کے حل کرنے کے لئے مولوی امام بخش صہبائی یا میر حسن معمائی درکار ہوں۔

حکیم غلام نجف خاں کے نام لندن سے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

میں خود اپنی تحقیق سے نہ کہ تقلید سے، دینِ اسلام کو حق سمجھتا ہوں۔ اس قدر یقین ان کو بھی نہیں ہوگا جو کہ مدینے سے پیر و خلیفہ اور مرشدی کا جبہ و دستار لے کر آتے ہیں۔

انجمن حمایت الاسلام لاہور کے ۱۸۸۴ء کے سالانہ اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام مکمل اور آخری مذہب ہے...... میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور و خوض کیا اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ دنیا میں اگر کوئی سچا مذہب ہے تو وہ اسلام ہے۔ میں اس دلی یقین پر اس کی تائید کرتا ہوں۔ نہ کہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں۔ (حیاتِ جاوید)

سرسیدؒ کے نزدیک اسلام کے بارے میں فکرِ اجتہاد کی ضرورت کس قدر شدید تھی اُس کا اندازہ اس کی ایک تقریر کے حسبِ ذیل اقتباس سے بخوبی ہو سکے گا۔

اس زمانہ میں ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے۔ جس سے یا تو ہم علومِ جدیدہ کو باطل ثابت کر دیں یا پھر (دوسری صورت میں) انھیں اسلام سے مطابق کر دکھائیں...... میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبیعی و فلسفے کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا (بصورتِ دیگر) ان کا بطلان ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار اور یقیناً گنہگار ہوں گے۔

اسی تقریر میں اُس نے کہا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہیں وہی صحیح ہیں مگر جب بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے کروں اور کوئی چارہ کار نہ تھا تو مجھ کو ضرور وہی کچھ کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں لوگوں کے کافر یا بیدین کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ برا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب مجھے برا کہتے ہیں یا

کا فرِ بتلاتے ہیں۔ میں ان سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں گا۔ میرا معاملہ بُرا ہو یا بھلا خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا آئندہ ہو گی۔ تو مجھے امید ہے کہ وہ خدا جو نیتوں کو جانتا ہے مجھے معاف کر دے گا۔

(حیاتِ جاوید)

غور و فکر اور علم و بصیرت کے اسی جذبہ و احساس سے اس نے دین کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی فکر و بصیرت بالآخر اس نتیجہ تک پہنچی کہ کسی مسئلہ

معیارِ صداقت صرف قرآن ہے

کی صداقت کا معیار صرف خدا کی آخری کتاب ہے (بقول حالی) اسی اصول کو ملحوظ رکھ کر اس نے تفسیر القرآن کا آغاز کیا۔ مولانا حالی حیاتِ جاوید میں سرسید کے اس مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اسلام کے متعارف مجموعے میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عنداللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمانؐ کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ جس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائلِ حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ پس انھوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر اپنے جدید علم کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق صرف قرآن مجید کو قرار دیا۔ اور اس کے سوا تمام مجموعۂ احادیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب دہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں، نہ کہ اسلام اپنی بحث سے خارج کر دیا۔ اسی اصول کو ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ (حیاتِ جاوید)

قرآن کا اعجاز

ہیومن ازم (HUMANGISM) کی تحریک (جس نے مغرب میں گویا ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر لی ہے) کے امام جولین ہکسلے (JULAIN HUXLEY) نے اگست ۱۹۵۲ء میں نیویارک کے ایک اہم اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس مذہب کی وہ تلاش میں ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے پیش ایسے انداز میں کیا جائے ـــــ

جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معنی ہو کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے۔ (نیویارک ٹائمز ۲۴ر اگست ۱۹۵۲ء)

یہ کس قدر عجیب و غریب حقیقت ہے کہ ہکسلے کی اس تقریر سے تقریباً اڑسٹھ سال قبل سرسید لاہور کی ایک تقریر (۱۸۸۴ء) میں اُس کتابِ عظیم کی نشان دہی کر رہا تھا جس کی تلاش میں آج ہکسلے جیسے عظیم فلاسفر طلسمِ پیچ و تاب بنے ہوئے ہیں۔ سنیئے! اس نے کہا تھا اور علیٰ وجہ البصیرت کہا تھا،

ضرور تھا کہ قرآن مجید کی ہدایتیں اس طرح بیان کی جائیں کہ اس سے ایک صحرائی اونٹ چرانے والا بدو اور ایک اعلیٰ درجہ کا حکیم سقراط برابر فائدہ اٹھائیں۔ قرآن مجید ہی ایسا کلام ہے جس میں یہ صفت موجود ہے۔ اور جس سے

مختلف درجوں بلکہ متضاد حیثیتوں کے لوگوں کی یکساں ہدایت ہوتی ہے۔ ایک جاہل بدو ایک مقدس مولوی اس کے معانی سے جیسی ہدایت پاتا ہے ایسا ہی ایک فلاسفر انہی الفاظ کے مقصود سے ویسی ہی ہدایت پاتا ہے اور کسی لفظ کو نیچر یا فلسفہ کے خلاف نہیں پاتا..... کوئی ایسی کتاب بتاؤ جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین فلسفہ اور حکمت سے بھرے ہوں اور پھر نہایت دلکش اور سہل الفاظ میں۔ اور پھر اس سے جاہل اور عالم، عامی اور فلسفی سب کو یکساں فائدہ حاصل ہو اور سب پر یکساں اثر ڈالے۔ نہایت ناممکن ہے مگر قرآن مجید ہی ہے جس میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اور یہی اس کا اصلی سچا اور واقعی معجزہ ہے۔ اس کے مسائل جیسے اُس زمانے میں سچے تھے جب زمین ساکن مانی جاتی تھی ویسے ہی اب بھی سچے ہیں اور قابل تسکین ہیں جبکہ سورج ساکن اور زمین گھومتی مانی جاتی ہے۔ (حیاتِ جاوید)

قرآن کریم کو اپنے فکر و اجتہاد کا معیار اور سرچشمہ قرار دینے کے بعد سرسیدؒ نے اہم دینی مسائل پر مسلک تقلید سے کلیۃً آزاد ہو کر غور و فکر شروع کیا اور اس کے بعد خطباتِ احمدیہ، تفسیر القرآن اور دیگر رسالوں میں جو کچھ پیش کیا وہ ندرتِ فکر و نظر کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے "مروجہ مذہب" کے مطابق صدیوں سے لونڈیاں اور غلام معاشرے کے جزو کی حیثیت رکھتے تھے اور ستم بالائے ستم یہ کہ کتب روایات سے اس کی تائید میں بہت کچھ پیش کیا جاتا تھا (آج بھی مذہبی لحاظ سے یہ سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جیسے بزرگ لونڈیوں اور غلاموں کے جواز میں عجیب و غریب قلمی کارنامے سرانجام دے رہے ہیں) اور انتہائی ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسری طرف دنیا کے سامنے بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اسلام دنیا سے غلامی کو مٹانے آیا تھا۔ سرسیدؒ کے علم و بصیرت اور تدبر فی القرآن نے شہادت دی کہ غلامی کا جواز اسلام کے مقدس اور پاکیزہ چہرے پر ایک بدنما داغ سے کم نہیں۔ اُس سے پہلے خطباتِ احمدیہ اور تفسیر القرآن میں اس کے خلاف لکھا اور پھر ایک مستقل مضمون میں جو "رسالہ ابطالِ غلامی" کے نام سے شائع ہوا اصولِ شرع کے مطابق دلیل و برہان کی پوری قوت سے اسے باطل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلاموں اور لونڈیوں کی حیثیت دینے کی کوئی وجہ جواز قرآن میں موجود نہیں۔ اور پھر انھوں نے ثابت کیا کہ جن آیات سے استرقاق کا حکم مستنبط ہوتا ہے۔ ان سے قطعاً ایسا استنباط نہیں ہوتا۔ انھوں نے واضح کیا کہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ جیسے قرآنی احکام میں جس ملک یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کا ذکر ہے وہ اس دور سے متعلق ہے جب آیۂ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً (۴۷/۴) ابھی نازل نہیں ہوئی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سورۂ محمدؐ کی اس آیت نے کہ جنگی قیدیوں کو یا تو احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر رسم استرقاق کو، جو دیگر اقوام کی طرح عربوں میں مروج چلی آ رہی تھی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اور اس کے بعد رسول کریمؐ نے کسی غزوہ میں قیدیوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا۔

اسلام اور غلامی

یہ موقع نہیں کہ غلامی کے عدم جواز میں ان دلائل و براہین کی تفصیل پیش کی جائے جو سرسیدؒ نے پیش کیں۔ ہم یہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ سرسید وہ شخص تھا جس نے مدتوں کے بعد اسلام کی درخشندہ پیشانی سے اس داغ کو دور کرنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ مروجہ غلط مذہبی عقائد

کے خلاف قلم اٹھانا بہت بڑی جرأت کا کام ہے اور سرسیدؒ جیسے جوانمردوں کے آئین میں حق گوئی و بے باکی کا یہ مظاہرہ ایمان کا درجہ رکھتا تھا۔ اس مسلک پر وہ ہر آگ میں مردانہ وار کود پڑتا تھا۔ اُس نے یہ نشانِ منزل قائم کیا اور ٹھیک انیس برس بعد (۱۸۸۸ء میں) مصر کے ایک روشن ضمیر شیخ الفاضل احمد شفیق بک اسی نشانِ منزل کی طرف آگے بڑھے اور اسلامی نقطہ نظر سے البطالِ غلامی پر وہ رسالہ لکھا جس نے ترکی و مصر کے علاوہ یورپی ممالک میں اُن کی فضیلت اور شہرت کی دھاک بٹھا دی۔

حضورِ رسالتمآبؐ سے محبت

سرسید کو اس ذاتِ اقدس و اعظم سے جن کے نعوشِ پا سے انسانیت کا صراطِ مستقیم جگمگا رہا ہے والہانہ محبت اور ارادت تھی اور مولانا حالی کے الفاظ میں[1] وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جس حدیث کا مضمون آنحضرتؐ کی جلالتِ شان کے منافی ہو میرے نزدیک وہ یقیناً موضوع اور مفتری ہے اگرچہ تمام محدثین کا اس کی صحت پر اتفاق ہو۔ بعض روایتوں پر جن کے ذریعے مخالفین کو آنحضرتؐ پر طعن کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ بعض اوقات انتہائی غیظ و غضب میں کہا اٹھتے تھے کہ اگر اس کا راوی میری حکومت میں یہ روایت کرتا تو میں اس پر مفتری کی حد جاری کرتا۔"

حضور نبی کریمؐ کی ذاتِ گرامی سے سرسیدؒ کی شیفتگی ان اشعار سے بخوبی واضح ہوتی ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر میں ایک موقع پر لکھے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

خدا دارم، دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰ دارم — ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم — ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

منشی سراج الدین احمد نے نواب امتصار جنگ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "سرسید کے کفر کا فتویٰ جو مولوی امداد علی نے علماء کے پاس ہر دو دستخط کے لئے بھیجا تھا۔ جب وہ مولوی سراج الدین احمد سنبھلی کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کو پڑھ کر یہ کہا کہ

میں ایسے شخص کی نسبت کفر کے فتوے پر دستخط کیونکر کر سکتا ہوں جس کو میں نے اپنی آنکھ سے آنحضرت صلعم کے ذکر پر چشم پُر آب اور زار زار روتے دیکھا ہے۔

معجزاتِ رسولؐ

دیگر مسائلِ دین کی طرح سرسید کی نبی اکرمؐ سے محبت و ارادت بھی علیٰ وجہ البصیرت تھی۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی وہ بصیرت کے خلاف اور مسلکِ تقلید کے تحت کسی چیز کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے مدلل طور پر یہ لکھا کہ معجزہ کسی طرح بھی دلیلِ نبوت نہیں بن سکتا اور قرآنی آیات سے یہ ثابت کیا کہ جب بھی کفار کی طرف سے معجزہ طلب کرنے میں اصرار ہوا تو حضورؐ نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ (۲۹/۵۰) یا سُبْحَانَ رَبِّیْ ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷/۹۳) یا لَوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِہٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ (۶/۵۸) یا وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ (۷/۱۸۸) معجزہ اگر نبوت کا ثبوت ہوتا تو کفار کو عند الطلب معجزہ دکھانا ضروری تھا لیکن پورے قرآن

---

[1] شعر خواہ سرسید ہی کا کیوں نہ ہو، بہت کم مبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔ اس شعر میں بھی شاعرانہ مبالغہ ہے جو ایک لحاظ سے مفہوم کو قرآنی حقیقت سے دور لے جاتا ہے۔

میں اس کا ذکر نہیں کہ کفار کے بار بار مطالبہ کے جواب میں کبھی معجزہ دکھایا گیا ہو۔

سرسید نے اپنے اس موقف کی تائید میں کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں بن سکتا، قرآنی آیات کے علاوہ دیگر دلائل و شواہد سے بھی بحث کی ہے انھوں نے اندلس کے مشہور فقیہ علامہ ابن رشد کی کتاب "الکشف عن مناہج الدولۃ فی عقائد الملۃ" سے بھی بہت سے تائیدی دلائل پیش کئے ہیں۔ علاوہ بریں شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی "تفہیمات" سے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "شقِ قمر ہمارے نزدیک معجزات میں سے نہیں ہے بلکہ علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴/۱) اور خدا تعالیٰ ان معجزات میں سے (یعنی آنحضرتؐ کے معجزات میں سے) اپنی کتاب میں کچھ ذکر نہیں کیا۔ اور نہ کہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے"۔

سرسید نے ان آیات کا بھی اپنی بحث میں حوالہ دیا ہے جن میں خدا کی طرف سے رسول کریمؐ کو بتایا گیا ہے کہ "اگر تو زمین میں ایک سرنگ ڈھونڈھ نکالے یا آسمان میں ایک سیڑھی لگائے تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو علانیہ جادو ہے"۔

الغرض سرسید نے اپنے اس فکر و بصیرت کی بنا پر مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا کا بنی انسان کی بصیرت کو دعوت دیتا ہے اور معجزات کے کسی ذہنی دباؤ سے انھیں قبولِ حقیقت پر مجبور نہیں کرتا۔ اس لئے اگر حتی معجزات کو (جن کی شہادت قرآن سے نہیں ملتی) تسلیم کر لیا جائے تو اس عظیم حقیقت کا بطلان ثابت ہو جاتا ہے۔

واقعۂ معراج معجزات کی طرح سرسید نے اپنی تفسیر القرآن میں مسئلہ معراج پر بھی ایک طویل اور محققانہ بحث کی ہے جو کم و بیش ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ آیاتِ قرآنی اور روایات پر بحث کی ہے اور پھر اختلافِ روایات کے اسباب و وجوہ کو بحث قرار دیتے ہوئے انھوں نے یہ استنباط کیا ہے کہ "معراج اور اسرار درحقیقت ایک ہی واقعہ تھا اور وہ ابتداء سے آخر تک روح کے ساتھ اور خواب کی حالت میں واقع ہوا تھا"۔ ضروری نہیں کہ ہم سرسید کے اس استنباط (یا ان کے دیگر اجتہادی نکات) سے متفق ہوں۔ یہ بہرحال ایک انسان کی انفرادی فکر ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ ہمارا مقصد اس موقع پر سرسید کے دینی فکر و اجتہاد کے مختلف گوشوں کی وضاحت کرنا ہے تائید یا تنقید مقصود نہیں۔

حجیتِ حدیث جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں سرسید کے نزدیک دین کے معاملہ میں حق و صداقت کا معیار اور سرچشمہ قرآن اور صرف قرآن تھا۔ احادیث کے بارے میں سرسید نے دیکھا کہ تمام محققینِ اسلام اس پر متفق ہیں کہ خبر متواتر اور خبر مشہور کے سوا جن کی تعداد کتب روایات میں نہایت قلیل ہے، جو احادیث خبر احاد کے ضمن میں شمار ہوتی ہیں اور جن سے صحاح ستہ اور دیگر تمام کتب احادیث بھری پڑی ہیں مفید یقین نہیں ہیں بلکہ ان میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے۔ اور انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس صورت میں کہ خبر احاد کی صحت ثابت ہو جائے اس پر صرف عمل کرنا جائز ہے اعتقاد رکھنا ضروری نہیں (اور بعض کے نزدیک تو عمل ضروری ہے نہ اعتقاد) سرسید اس موقف سے بھی آگے بڑھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ جب خبر واحد میں صدق و کذب کا احتمال باقی ہے تو پھر جس خبر واحد کی رُو سے اسلام پر حرف آتا ہو یا اعتراض کی گنجائش پیدا ہوتی ہو آخر اسے تسلیم ہی کیوں کیا جائے۔ اور اسلام کو اس کے لئے جوابدہ کیوں بنایا جائے۔ اس بنا پر سرسید ہر ایسی روایت کے منکر تھے جو اسلام اور سیرتِ نبی اکرمؐ کو داغدار کرنے کا باعث ہو۔

عقیدۂ ناسخ و منسوخ

ہمارے ہاں صدیوں سے (دیگر غلط عقائد کی طرح) یہ عقیدہ متوارث چلا آرہا ہے کہ قرآن کی بعض آیات نے دیگر آیات کے احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس لئے وہ منسوخ آیات اب قابلِ عمل نہیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں (اس عقیدہ کی بنا پر) منسوخ آیات کی تسلیم شدہ تعداد ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک زمانہ میں ان کی تعداد پانچ تک پہنچی تھی۔ امام سیوطیؒ نے انھیں بیس تک محدود کر دیا۔ اور پھر شاہ ولی اللہ صاحب نے انھیں گھٹا کر پانچ تک پہنچا دیا۔ (اور ان کے بہت بڑے شارح، مولانا سندھی نے ان پانچ میں بھی تطبیق کی صورت نکال دی) کتاب اللہ کے بارے میں یہ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ اس قدر عجیب و غریب تھا کہ اس نے سرسیدؒ کو بھی دعوتِ فکر دی اور طویل غور و فکر کے بعد انھوں نے اس عقیدہ کی تردید کی اور خطباتِ احمدیہ میں واضح کیا کہ قرآن کی جس آیت سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا ہے۔ اس کا سیاق و سباق اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ وہاں نسخ سے مراد سابقہ شریعتوں کا منسوخ ہونا ہے نہ کہ قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت کو منسوخ کرنا۔ سرسیدؒ کی فکر و بصیرت کے اس استنباط نے قرآن کریم کو ایسے غلط عقیدے سے بچانے کی کوشش کی جو خدا کی اس آخری کتاب کی حقیقی اہمیت و عظمت پر بے طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔

تقاضائے وقت کا جواب

سرسیدؒ کی اجتہادی کاوشوں کے سلسلہ میں اس پس منظر کو ہر قدم پر پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ سرسیدؒ کا دور وہ دور تھا جب برطانوی ملوکیت یہاں اپنے قدم جما چکی تھی اور اس غیر ملکی حکومت کے قائم ہوتے ہی نئے حکمرانوں کے ہم مذہب عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ کے پُرجوش ولولوں میں یہاں جوق در جوق اور منظم طریق پر سرگرمِ کار ہو چکے تھے۔ اس جوش و خروش میں ان کے اشاعتی (بلکہ تنقیدی) حملوں کا رخ بیشتر اسلام کی طرف تھا۔ اور صدیوں کی حکومت چھن جانے کے بعد مسلمانوں کی محکومی اور مظلومی نے انھیں مزید شہ دے دی تھی کہ وہ (گویا صلیبی جنگوں کا انتقام تبلیغی میدان میں لینے کے لئے) اسلام کو بالخصوص ہدفِ تنقید و تعریض بنائیں۔ دوسری طرف یہاں کے مسلمان اپنی رجعتِ قہقری اور شکست کے زخموں سے چُور چُور عالمِ بے بسی میں یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ہمارے مذہبی اجارہ داروں نے جن کا جوش و خروش تفرقہ بازی اور "فی سبیل اللہ فساد" میں کبھی سرد نہیں پڑا، اس نازک مرحلہ پر اس ڈرامے کو ٹک ٹک دیکھ رہے تھے اور لبوں پر مہرِ سکوت لگی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جن امور میں اسلام تنقید کا نشانہ بن رہا تھا۔ وہ انہی "فقیہانِ حرم" کے "عجمی اسلام" کی تخلیق تھے اور حقیقی اسلام کو اس سے دور تک کا واسطہ نہ تھا۔ گویا ان ہی کی تاویلات تھیں جو صدیوں سے اسلام کو داغدار کئے چلی آرہی تھیں اور ان کے لگائے ہوئے یہ داغ تھے جنھیں "اسلام" قرار دے کر عیسائی مشنریوں کے لئے خدا کے آخری دین کو ہدفِ مطاعن بنانے کی وجہ جواز اور سند حاصل ہو گئی تھی۔ اور اب جبکہ اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی تو مذہب کے یہ اجارہ دار بالعموم تقدس کے نقاب اوڑھے گوشۂ تنہائی میں تماشائی بنے دم بخود بیٹھے تھے۔

سرسیدؒ اس صورتِ حال سے کس قدر متاثر تھا۔ اس کے سینے میں ہیجان و اضطراب، اندوہ و ملال اور غیض و غضب کے کتنے طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس کے دن کا چین اور رات کی نیند کس طرح حرام ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح شب و روز درد و کرب میں قبلہ نما کی سوئی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کا اندازہ ان خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے اپنے احباب کو لکھے اور وہ اعزا و اقربا اس کے شاہد ہیں جنھوں نے اسے بستر استراحت چھوڑ کر راتوں کو سرگرداں پھرتے، آہیں بھرتے، آنسو بہاتے اور والہانہ دعائیں مانگتے دیکھا۔ یہی اضطراب اُسے کبھی "خطباتِ احمدیہ" کی تیاری

کے لئے انگلستان تک لے پھرا۔ اور کبھی تبیین الکلام اور تفسیر القرآن کی اشاعت کیلئے اس کے قلم کو حرکت میں لایا گیا۔ اس کی ان فکری اور اجتہادی کوششوں نے نہ صرف سر ولیم میور جیسے فاضل عیسائیوں کے اعتراضات کا منہ بند کیا بلکہ اسلام کی دلکشی کو بھی بدنما داغوں سے صاف کرنے کا قابلِ قدر کارنامہ سرانجام دیا۔

سرسید کی عظمت کا یہ کس قدر درخشندہ نقش ہے کہ سرکاری ملازمت کی مجبوریوں کے باوجود وہ ایک طرف سیاسیات کے طوفانوں میں سفینۂ ملت کی ناخدائی کا فریضہ جرأت و عزیمت سے سرانجام دے رہے تھے اور دوسری طرف مذہبی جولانگاہ میں وہ عظمتِ اسلام کے گرتے ہوئے پرچم کو پوری ہمت، مردانگی اور دلائل و براہین کی قوت سے تھامے ہوئے تھے۔ صورتِ حال کا تقاضا کیا تھا اور انھوں نے کس احساس کے تحت اسے لبیک کہا، اس کی تفصیل خود سرسید ہی کی ایک تقریر سے سنیئے۔ صورتِ حال کی وضاحت کے بعد وہ فرماتے ہیں۔

> میرا یقین ہے کہ حقیقی مذہب کا یہ نقصان نہیں بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرے پر لگ گئی ہیں یا لگا دی گئی ہیں۔
>
> میں ہرگز اس لائق نہیں کہ اسلام کے نورانی چہرے پر سے ان غلطیوں کے سیاہ دھبوں کے چھڑانے کا دعویٰ کروں۔ اور حمایت اسلام کا کام اپنے ذمے لوں۔ یہ منصب اور فرض دوسرے مقدس اور باعلم لوگوں کا ہے لیکن جب میں مسلمانوں میں ان علوم کے پھیلانے کا مدعی ہوں جن کی نسبت ابھی میں نے بیان کیا کہ وہ (مروجہ) اسلام کے کس قدر خلاف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے امکان میں ہو اس طرح اسلام کی حمایت کروں۔ میرا کانشنس (ضمیر) مجھ سے کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے۔ (حیاتِ جاوید)

سرسیدؒ کی اس فکری کد و کاوش کی محرک اسلام کی وہ عالم آرا صداقت تھی جس سے اس کے قلب و نظر منور تھے اور جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> ان (باطل) مذاہب کے بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعۃً اسلام نمودار ہوا اور اسے حیرت انگیز سرعت میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا۔ اور دفعۃً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھرپور کر دیا۔ (خطباتِ احمدیہ تیسرا خطبہ)

تعدد ازدواج

تعدد ازدواج کا مسئلہ معاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔ سر ولیم میور اور اس جیسے دیگر عیسائی مستشرقین نے بیشتر اسی (تعدد ازدواج) کے مسلمانوں میں جواز (کے مروجہ تصور) پر اعتراضات اٹھائے ہیں۔ اسی تحریک کے سلسلے میں سر ولیم میور کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔

> تعدد ازدواج کا حکم عام اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے۔ عام زندگی کو آلودہ و ناپاک کرتا ہے اور تمدن معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

اسلام کے خلاف اس اعتراض پر جو عیسائی مشنریوں میں اُس وقت زبانِ زدِ عام تھا سرسید نے خطباتِ احمدیہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ انھوں نے اس بحث میں پہلے یہ بتایا ہے کہ سیاستِ مدن کے لحاظ سے ازدواجی زندگی تقاضائے بشریت اور اس سلسلہ میں معاہدۂ نکاح باعثِ حسنِ معاشرت ہے۔ یہاں انھوں نے طلاق کے ذکر میں واضح کیا ہے کہ یہ حق مرد اور عورت دونوں کو حاصل ہونا چاہیئے۔ پھر ڈیون پورٹ مسٹر گنز اور مشہور و معروف عیسائی فاضل جان ملٹن کے حوالوں سے تعدد ازدواج کی تائید ثابت کی ہے اور اس کے بعد مذہبی نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلام نے تعدد ازدواج کا جس حسن انداز سے سدباب کیا ہے اس کی مثال نہ یہودیت میں مل سکتی ہے نہ کسی اور مذہب میں۔ پھر قرآنی آیات سے انھوں نے اس حقیقت کو نکھار کر پیش کیا ہے کہ اسلام صرف خاص اور ہنگامی حالات میں تعدد ازدواج کی اجازت دیتا ہے۔ عام حالات میں قطعاً نہیں۔ کیونکہ جب قرآن یہ کہتا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳) یعنی "اگر تم ڈرو کہ انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی"۔ اور پھر انھوں نے اسی سورۂ نساء کی دوسری آیت پیش کی ہے جہاں کہا گیا ہے وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ (۴/۱۲۹) یعنی "تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہشمند کیوں نہ ہو یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ تم عورتوں میں عدل کر سکو"۔ اور اس سے استدلال کیا ہے کہ جب خدا کے نزدیک عدل کرنا مرد سے ممکن ہی نہیں تو ایک عورت سے زیادہ کے ساتھ ازدواج کا (خصوصی حالات کے سوا) سوال ہی باقی نہیں رہتا۔[1]

ملوکیت اور اسلام نظامِ مملکت کے لحاظ سے مختلف تصورات مروج چلے آ رہے ہیں۔ اور اسے کاروانِ انسانیت کی انتہائی بدنصیبی سمجھئے کہ جس اسلام نے دنیا کو آزادی کا پروح نواز تصور عطا کیا تھا کہ کسی انسان کو خواہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت سے بھی کیوں نہ سرفراز کیا گیا ہو یہ حق حاصل نہیں کہ نوعِ انسانی پر حکومت کا مدعی بن سکے ــــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) اُس دین میں السلطان ظل اللہ علی الارض کا نعرہ لگا کر ملوکیت کے جواز میں "مقدس سند" بھی پیدا کر لی گئی۔ سرسید نے اس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے وہ کس قدر جمہوریت پسند اور ملوکیت کے مخالف تھے۔ اس کی وضاحت ان کی ایک تحریر سے ہو گی ــــ یہ لندن کے ایک انگریز کے نام ان کے خط کا اقتباس ہے۔

> ابھی تک میری رگوں میں عرب کا خون گردش کرتا ہے۔ اور پھر میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پختہ یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے۔ وہ نہ شخصی گورنمنٹ سے موافق ہے اور نہ لمیٹڈ مانرکی (LIMITED MONARCHY) کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت کو بھی ناپسند کرتا ہے۔ ایک پریذیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہے۔

سرمایہ داری کا نظریہ سرسید کے نزدیک سرمایہ داری کے نظریہ کو اسلام کی تائید حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مذکورہ اقتباس کا اگلا حصہ ان کے اس نظریہ کو واضح طور پر سامنے لے آتا ہے اور وہ اس ایک فقرے میں اسے صاف طور پر کہہ گئے ہیں ــــ

---

[1] تعدد ازدواج کے خلاف یہ دلیل کمزور ہے۔ قرآن اس کے متعلق دوسری دلیل دیتا ہے۔

وہ (اسلام) اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔

اور یہ قرآن کے اس محاکمہ کا عکس ہے جس میں کہا گیا ہے

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ (۵۹)

طائر پیش رس ہم نے دین سے متعلق مختلف امور میں سرسید کی فکری کاوشوں اور نظریات کو اجمالاً پیش کر دیا ہے۔ ان کی یہ کاوشیں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ انھیں کما حقہٗ تفصیلی انداز میں پیش کیا جائے۔ بہرحال ان کے نظریات و تصورات کے مختلف گوشوں کو سمٹا کر یہاں جمع کر دیا گیا ہے اور اس سے یہ واضح ہو سکیگا کہ اُس کے فکر و بصیرت کی ان گرانمایہ کوششوں نے مذہبی عقاید و افکار کے صدیوں کے جمود میں کیسی حرکت اور تموج پیدا کر دیا اور پھر اجتہاد اور تجدد کی یہ لہریں متحرک طور پر آگے بڑھیں اور دینی اجتہاد کی وہ راہیں جو مدتوں سے بند پڑی تھیں از سر نو کاروانِ فکر کے قدم لینے لگیں۔ آج جبکہ مسلمان مفکرین پورے یقین و اعتماد کے ساتھ محفل ذہن میں فریضۂ اجتہاد کی ادائیگی کا عزم لے کر نکلے ہیں اور افکار و تصورات کی بزمِ کہن وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق فکر و بصیرت کی نو بنو تبدیلیوں سے جگمگا اٹھی ہے ہم سرسید کے اس احسانِ عظیم سے سبکدوش نہیں ہو سکتے کہ انھوں نے انتہائی تاریکیوں میں اس مبارک و مسعود کام کا آغاز کیا ہے۔ سرسید کی روح آج مفکرین اسلام کی تازہ بتازہ کاوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وجد و مسرت میں جھوم جھوم کر کہہ رہی ہے۔

دیدۂ آغاز، انجام نگر

اور آج کون ہے جو اس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکے کہ

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ سرسید کے تدبر فی القرآن اور تفکر فی الاسلام کے کئی نتائج ایسے ہیں جو ہمیں آج بہت کمزور اور بے وزن نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے حقائق کو ہمیشہ اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی ایک دور کا سمجھا ہوا قرآن آنے والے زمانے کے لئے سند اور حرفِ آخر قرار نہیں پا سکتا۔ آج ہم سرسید کے زمانے سے ایک سو سال آگے ہیں اور اس ایک صدی میں انسانی علم و تحقیق نے جو منازل طے کی ہیں وہ سابقہ ادوار میں کئی صدیوں کے عرصہ میں بھی نہیں کی تھیں۔ اس اعتبار سے ہمارا دور سرسید کے دور سے علمی اور فکری اعتبار سے بہت آگے ہے اور اسی لئے جن مفکرین نے اس زمانے میں اپنے تدبر فی القرآن کے نتائج پیش کئے ہیں، وہ سرسید کے فکری نتائج کے مقابلہ میں کہیں بلند اور محکم دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس سے سرسید کی فکری عظمت کم نہیں ہو جاتی۔ جس شخص نے کبھی غبارہ (BALOON) میں دھواں بھر کر فضا میں اڑنے کی کوشش کی تھی، سپٹنک (SPUTNIK) کی ایجاد سے اُس کے مقام میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سابق اوّل (PIONEER) بہرحال سابق اوّل ہی رہتا ہے۔ خواہ بعد میں آنے والے اس سے کتنے ہی آگے کیوں نہ نکل جائیں۔ فکری کاوش اور اجتہادی کوشش بجائے خویش معرکہ آرا کارنامہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجتہد کو دہرا اجر ملتا ہے۔ اگر اس کا اجتہاد صحیح ہے تو دو حصے۔ اور اگر غلط ہے تو ایک حصہ۔ مولانا آزاد تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ

کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

اور اقبال کا موقف یہ ہے کہ

گر از دستِ تو کارِ نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اور سرسید کی کوشش نہ بیہودہ تھی اور نہ ہی گناہ۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس کے بعض نتائج کو "اجتہادی غلطی" کہہ سکتے ہیں جو بہرحال ایک حصہ اجر کی مستحق ضرور ہے۔ سرسید نے صدیوں کے جمود کی سلوں کو توڑا اور آنے والوں کے لئے فکر و تدبر کا راستہ صاف کیا۔ اس کا یہ کارنامہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے بعد آنے والے قرآنی فکریں کتنا ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائیں، اُس سابق اوّل کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے یہی کیفیت ہمارے دور کے مفکرین کی بعد میں آنے والوں کے مقابلہ میں ہو گی۔

مخالفت کا طوفان لیکن یاد رکھیئے کہ یہ داستان اُن مشکلات و موانعات کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہے گی جو اس راہ میں ہر فاتح باب اجتہاد اور تجدید فکر کے علمبردار کے سدِّ راہ بنتی ہیں اور جنھوں نے سرسید کے عزم و ہمت اور ذوقِ سفر کو شکست دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ سرسید ہی کا دل گردہ تھا کہ اُس نے گالیاں کھائیں، قتل کی دھمکیاں سنیں، رسوائی کا گرد و غبار چاروں طرف سے بڑھتا دیکھا، تکفیر کے زہریلے تیروں کو اپنے ارمان پورے کرتے پایا لیکن وہ جرأت و استقامت کا ہمالہ بن کر اس طوفان میں بے مثال عزیمت اور استقلال کا درخشندہ ثبوت دیتا چلا گیا۔ اس کے صبر و عزیمت کی بے مثال کیفیت اس تحریر سے جھلکتی نظر آئے گی جو "عرضداشت بخدمت اہلِ وطن" کے عنوان سے اس کی طرف سے سوسائٹی کے اخبار میں شائع ہوئی۔ یہ تحریر نہیں یہ ایک صدائے دردناک ہے جو سازِ دل کے زخمی تاروں سے مرتعش ہو رہی ہے۔ آپ بھی سنیئے۔

> میرا گناہ سوائے اسلام کی خیر خواہی کے اور کچھ نہیں ع نیست یارانِ طریقت غیر ازیں تقصیر ما..... میری اس دلسوزی کو میرے ہم وطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ الٹا سمجھا۔ اور کوئی الزام، عیب، برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی جو علانیہ اور خفیہ میری طرف منسوب نہ کی گئی ہو۔ مگر میری دلسوزی کسی صلہ کی توقع پر نہیں تھی بلکہ اس کا اجر خدا سے لینا ہے۔ اس لئے میرے ہم قوموں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی مجھے ناگوار نہیں گذری۔ اور خدا نے اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ پرانے دوستوں کی باتیں بری معلوم ہوتی ہیں نہ نئے شفیقوں کی تشنیع رنج دیتی ہے۔ نہ کانپور کی بیب اداؤں سے رنج ہوتا ہے۔ نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے۔ نہ الہ آباد اور آگرے کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں۔ نہ مراد آباد اور رامپور کے فتوے۔ نہ دہلی کے اہلِ جبہ و خانقاہ کی اگماد۔ دل کو دکھاتی ہے اور نہ حامیانِ حرمین شریفین کی رفتار۔ عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ ہی نہیں چھوڑی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

مخالف کتابیں اور رسائل کا اجراء سرسید کی تفسیر القرآن کے جواب میں جہاں "تفسیر حقانی" جیسی بہت سی تفسیریں

محض "مخالفت برائے مخالفت" کی جذباتی روش کے تحت لکھی گئیں وہاں مولوی امداد العلی نے "امداد الاحتساب" اور مولوی محمد علی نے "مزیل الاوہام" کے نام سے رسالے بھی شائع کئے۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق کے توڑ پر کانپور سے "نور الآفاق" اور "نور الانوار" مراد آباد سے "لوحِ محفوظ" اور ان کے علاوہ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب ریوپی سے "امداد الآفاق"، "شہاب ثاقب"، "تائید الاسلام" اور "اشاعت السنہ" جیسے اخبار بھی جاری کئے گئے۔ ان کتابوں، تفسیروں، رسالوں اور اخباروں میں سرسید کے عقائد و نظریات کو غلط رنگ دے کر پیش کیا گیا اور پھر سارا زورِ قلم انھیں ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، دجال، کافر جیسے خطابات عطا کرنے پر صرف کیا گیا۔ کفر کے فتاوی حاصل کرنے کے لئے مدتوں قریہ قریہ، قصبہ قصبہ، شہر شہر مہم چلتی رہی۔ ان فتووں پر ہر فرقے کے مولویوں کے دستخط ہوتے تھے۔ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، وہابی بدعتی، مشہور، غیر مشہور سب فرقوں کے مولانا اس تکفیر بازی کے جہاد میں شریک ہو کر ثوابِ دارین حاصل کر رہے تھے۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں ان فتووں کی کچھ مثالیں اور کچھ نقلیں پیش کی ہیں۔ ان میں وہ فتاوی بھی شامل ہیں جن پر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے "علمائے کرام اور مفتیانِ عظام" کے دستخط حاصل کئے گئے۔ ان فتووں میں سرسید، ان کے رفقا اور دار العلوم کے متعلق جو جو مذموم الفاظ استعمال کئے گئے ان سے اور نہ بھی اس رسول اکرم کے "جانشینوں" کے حسنِ اخلاق کا بخوبی اندازہ لگ سکے گا جو رحمۃ للعالمین تھے۔

رہ و رسمِ کفر بازی

دار العلوم (علی گڈھ) کی تعمیر کے سلسلہ میں مولوی کریم اللہ دہلوی نے اپنے فتوی میں لکھا:۔

> تعمیر کرنا اور کرانا بقول دخل اس قائل کے ایسے مکان کا، اور معاونت کرنی ایسے طلباء کی... بالکل باطل اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا، اور محل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے.... بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم اور ایسے بے محل میں ساعی ہونا ہمہ اور مطلب بنا لازم.... سنے نے یوں سمجھے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں.....

فرنگی محل کے مشہور مولوی عبدالحی صاحب کے فتوے کے بعض حصے ملاحظہ ہوں۔

> وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد..... وہ شخص مخرب دین، ابلیس لعین کے وسوسے سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ جب فتوے پر چوٹی کے ساٹھ مولویوں کی مہروں اور دستخطوں سے سرسید کی تکفیر پر "اجماع" ہو گیا تو ایک مولوی علی بخش خاں صاحب نے اس "جہادِ تکفیر" کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ وہ یہاں سے بھاگم بھاگ مکہ معظمہ پہنچے اور سرسید کے مذہبی عقائد کے متعلق حسبِ منشا استفتاء تیار کر کے مذاہبِ اربعہ کے مفتیوں سے بھی سرسید کے "کفر" کی تصدیق حاصل کر لی۔ ان "مفتیانِ شرع متین" کے فتاوی کی عبارتوں کے بعض حصے ہدیۂ قارئین ہیں۔

> یہ شخص ضال اور مضل ہے، بلکہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاری کے فتنے سے بڑھ کر ہے۔ واجب ہے اولی الامر پر اس سے انتقام لینا۔

مدینہ منورہ کے مفتیٔ احناف شیخ محمد ابن بالی نے مذکورہ استفتاء پر جو جواب تحریر فرمایا وہ بھی سن لیجئے۔

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شریعت سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے۔ ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے اور ولاۃ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔

سرسید کے مدرسہ علی گڑھ کے متعلق انہی بزرگانِ مدینہ منورہ نے یہ فتویٰ صادر فرمایا۔

یہ مدرسہ جس کو خدا برباد کرے اور اس کے بانی کو ہلاک کرے۔ اس کی اعانت جائز نہیں۔ اگر مدرسہ تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے۔

تاریخ کا کس قدر عبرت انگیز سانحہ ہے کہ دینِ خدا کے خود ساختہ اجارہ داروں کی طرف سے دہلی تا مکہ و مدینہ تک یہ جہادِ تکفیر اس شخص کے خلاف ہو رہا تھا جس کا سب سے بڑا گناہ اور جرم یہ تھا کہ اس نے ملتِ اسلامیہ کی بگڑی بنانے کے لئے زندگی وقف کر رکھی تھی۔

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

اور اس سے بڑھ کر طرفہ تماشا یہ ہے کہ مختلف مذہبی فرقوں کے وہ اجارہ دار جو دینِ خدا کے کسی اصول پر کبھی متفق نہ ہو سکے اور ہمیشہ دوسرے فرقے کو کافر سمجھا کئے ان کا اجماع ہوتا ہے تو اس دیوانۂ ملت کی تکفیر پر جس نے کڑے اور نازک مرحلے پر پوری ملت کو موت سے بچا کر نئی زندگی عطا کی۔ اقبال نے شاید یہ سرسید ہی کی زبان سے کہا تھا۔

یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

مولانا حالی "حیاتِ جاوید" میں مذکورہ فتووں کی تفصیل پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں اور کس قدر درست اور بجا لکھتے ہیں۔

درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں بلکہ سرسید کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تمغے انہی لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ امام غزالی اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ جس شخص پر لوگ حسد نہ کریں اُسے حقیر سمجھو اور جس کو کافر اور گمراہ نہ کہیں اسے ناچیز جانو۔ ابو الائمہ علی مرتضیٰؓ نے جو ایمان کی تعریف بتائی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم نے اپنے زمانے میں اس کا صحیح مصداق سرسید احمد خاں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ فرماتے ہیں (ترجمہ) "ایمان کی تعریف یہ ہے کہ جب سچ کہنا مضر ہو اور جھوٹ کہنا مفید اُس وقت سچ کو جھوٹ پر مقدم سمجھا جائے۔"

اسی سلسلے میں چند سطور کے بعد وہ مزید یہ لکھتے ہیں۔

غدر کے بعد جب کہ مسلمانوں کی حمایت کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا اور دینِ اسلام امن اور انتظام کا دشمن اور فتنہ و فساد کا بانی خیال کیا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ حمیتِ اسلامی اور جوشِ ایمانی کے امتحان کا وقت

> اور کیا ہو سکتا تھا۔ اُس وقت اسی کا فر اور واجب القتل کے سوا، اسلام اور اہل اسلام کی حمایت کے لئے نہ ان مستفتیوں میں سے کوئی اٹھا جنھوں نے اُس کے کافر اور مرتد ہونے کے فتوے لکھوائے اور نہ ان مفتیوں میں سے جنھوں نے اس کے کفر و ارتداد کے فتووں پر آنکھیں بند کر کے مہریں لگائیں اور دستخط کئے۔

سوچئے کیا کر رہا تھا اور اس کے مخالفین کیا۔ اور اگر سرسید مذہب کے ان اجارہ داروں کی غوغا آرائی سے دب کر اپنی کوششوں کو ترک کر دیتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ اس کا اندازہ ان حالات کے مطالعہ سے لگ سکتا ہے جن میں سرسیدؒ اپنی تحریک کو لے کر اٹھا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائی مشنریوں کے لشکر، اپنی ہم مذہب حکومت کے زیر سایہ عاطفت، یلغار کرتے چلے آ رہے تھے۔ ان کا یہ محاذ کلیۃً اسلام کے خلاف تھا۔ اس مہم میں یہاں کا ہندو بھی ان کا ہم قدم تھا۔ جو اسلام ہمارا قدامت پرست طبقہ پیش کر رہا تھا اور جسے حقیقی اسلام سے دور کی بھی نسبت نہیں تھی، وہ ان دشمنوں کے حملوں کی تاب لانے کے قابل نہ تھا۔ چشم حقیقت بیں دیکھ رہی تھی کہ مسلمان، جو سیاسی طور پر پہلے ہی بُری طرح پٹ چکا تھا، اب ان مشنریوں کے اعتراضات سے ذہنی طور پر مرعوب ہو رہا تھا۔ اگر ان حالات کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تو مسلمان فوج در فوج عیسائیت کی آغوش میں چلا جاتا۔ اگر ایک مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی یا ہندو ہو جائے تو یہ محض ایک فرد کی کمی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد اس کی اولاد پیدائشی طور پر عیسائی یا ہندو ہوتی ہے اور یہ سلسلہ اولاد در اولاد آگے چلا جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس طرح بہ ہیئت مجموعی کس قدر نقصان ہوتا ہے۔ اور اگر کسی وقت (ایک فرد کے بجائے) لاکھوں اور کروڑ ہا کی تعداد میں مسلمان، دوسرا مذہب اختیار کر لیں تو اس سے کس قدر نقصان ہوگا، اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ تھا وہ مہیب و عظیم خطرہ جس کے احساس سے، سرسیدؒ اس محاذ کے مقابلے کے لئے اٹھا ——— اور تن تنہا اٹھا ——— اس نے اپنے علم و بصیرت کے مطابق، ان تمام اعتراضوں کا جواب دیا جن کا کوئی جواب ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس نہ تھا۔ اس سے عیسائی مشنری اپنے مذموم مقاصد میں کس قدر خائب و خاسر و نامراد رہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو اس زمانے کے مشنریوں کے احوال و کوائف کا مطالعہ کیجئے۔ اس طرح سرسیدؒ نے اس سیلاب بلا کو روک کر، ہندوستان کے مسلمان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے مرے اور اس کی اولاد مسلمان پیدا ہو۔ آپ سوچئے کہ اگر اس وقت مذہب کے ان اجارہ داروں کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں جو سرسید کی مخالفت میں ہجوم کر کے لائی جا رہی تھیں تو آج ہندوستان (اور پاکستان) میں ہمارا کیا حشر ہوتا؟

ہمارا قدامت پرست طبقہ بہت ناک بھوں چڑھا کر کہتا ہے کہ اس قسم کے مسلمان باقی رکھنے سے فائدہ کیا تھا جن کے عقائد صحیح نہ ہوں۔ ہم ان سے پوچھتے یہ ہیں کہ جو مسلمان سرسید کی کوششوں سے مسلمان رہے، اگر ان کے عقائد صحیح نہیں، تو جو لوگ آپ حضرات کی مقدس کوششوں سے مسلمان رہے ہیں ان کے عقائد کون سے صحیح اور سچے مسلمانوں جیسے ہیں؟ اگر سرسید مسلمانوں کو مرتد ہونے سے بچانے کی خاطر اسلام کے کسی اصول کی خلاف ورزی کرتا اور اصل دین کے خلاف عقائد پھیلاتا تو واقعی اس کا جرم ناقابل معافی ہوتا لیکن اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بعض تاویلات آپ کے نزدیک صحیح نہیں تھیں۔ اور اس کا اثر اس کے دور کے مسلمان اور اس کی اولاد پر پڑا ہے۔ اب آپ ان غلط عقائد کی اصلاح کر دیجئے۔ یہ کام آسان ہے۔ اس کے مقابلہ

ہیں اگر اس زمانے کا مسلمان، اسلام ہی چھوڑ جاتا تو اس کی اولاد پیدائشی طور پر غیر مسلم ہوتی۔ ان غیر مسلموں کو از سر نو مسلمان بنانا آپ کے بس کی بات نہ ہوتا۔ اس مقام پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ چند سال ادھر کا ذکر ہے پاکستان کے ایک مولانا جو اقامت دین کے بہت بڑے مدعی ہیں سرسید کے خلاف بڑے جوش و خروش سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ اس پر ایک ستم ظریف اور من چلے نے ان سے پوچھا کہ حضرت! ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک بات بتلائیے اور وہ یہ کہ اگر سرسید یہ کچھ نہ کرتا تو آپ کے والد ماجد مسلمان ہوتے؟ جواباً مولانا خاموش تھے۔ مولانا کو خاموش پا کر اس نے کہا کہ قبلہ! یقین فرمائیے۔ اگر اس دور میں سرسید نہ ہوتے تو دیگر نوجوانوں کی طرح آپ کے والد محترم بھی اغیار کے ہو چکے ہوتے اور آپ آج حضرت مولانا...... کے بجائے مسٹر جیمز یا لالہ گردھاری لال ہوتے۔ اور اقامت دین کے مدعی ہونے کے بجائے عیسائیت یا شدھی کی تحریک کے علمبردار۔ یہ ایک واقعہ بھی ہے اور تاریخی حقیقت بھی۔

کہا جاتا ہے کہ کسی شخصیت کی عظمت کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو اس کی طبعی موت کا انتظار کرو۔ آج نہ تو سرسید اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ ان کو کافر و شیطان قرار دینے والے فتویٰ باز۔ آج صرف تاریخ کی بارگاہ سے یہ جواب مل سکے گا کہ حقیقت حال کیا تھی بلکہ کون نہیں جانتا کہ تاریخ اپنا اٹل فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ اور اس فیصلے سے انکار کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں کہ سرسید اپنی ملت کے رہنما تھے اور اسلام کے عظیم و جلیل علمبردار اور مفکر۔ ایسے رہنما اور مفکر جو قوموں کو نئی زندگی سے نوازدیں بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

(بقیہ "زکوٰۃ" صفحہ ۲۸ سے آگے)

نظام حکومت قائم ہو گیا تو صدقات سے مراد وہ عطیات وغیرہ ہو گئے جو اسلامی حکومت بعض ہنگامی ضروریات کے لئے طلب کرتی ہے لیکن یہ ہنگامی عطیات ہوں یا دیگر مدات آمدنی ان سب کا سرچشمہ قلب کا یہ میلان ہے کہ ہم نے وہ نظام ربوبیت قائم کرنا ہے جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کے نشوو ارتقاء کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس وقت عطیات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وقت زائد از ضرورت سب کچھ مملکت کی تحویل میں ہوتا ہے جس سے وہ "ایتائے زکوٰۃ" (نوع انسان کو سامان نشوونما دینے) کا فریضہ ادا کرتی ہے۔

ضروری اعلان

اگر کسی صاحب کے پاس ادارہ طلوع اسلام کا ۱۹۴۰ء کا شائع کردہ پمفلٹ "واردھا اسکیم" موجود ہو تو حسب ذیل پتہ پر بذریعہ ڈاک ہدیتاً یا قیمتاً ارسال فرما دیں۔ (پیرزادہ عبدالقیوم۔ ڈی شاہ انکلائن۔ حیدرآباد (مغربی پاکستان))

حقائق و عبر

۱۔ مادی اسباب و قوانین

دسمبر ۱۹۵۹ء کے رسالہ ترجمان القرآن کے اشارات میں، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق گفتگو کی گئی ہے اس ضمن میں کہا گیا ہے۔

آپ ذرا ان پروگراموں، اسکیموں اور منصوبہ بندیوں کا جائزہ لیں جو ملک و ملت کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے تیار کی جا رہی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ذرائع و وسائل کو جمع کرنے کی تو ساری تدبیریں موجود ہیں لیکن اگر کوئی شے خارج از بحث ہے تو وہ صرف "رجوع الی اللہ" ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت اس پانچسالہ منصوبے کی کاپیاں پڑی ہوئی ہیں جو ہم نے اپنی قوم کا معاشی معیار بلند کرنے کے لئے تیار کیا ہے۔ اس منصوبے میں اغراض و مقاصد سے لے کر زراعت، صنعت و تجارت اور بیکاری قدرتی ذرائع اور آبادی الغرض ہر اس چیز پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس سے کسی قوم کے وسائلِ رزق میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اگر کسی پہلو کو ناقابلِ التفات سمجھا گیا ہے تو وہ اخلاقی اور روحانی پہلو ہے۔ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر ہمارے ہاں رزق کی تنگی ہے تو اس کے کچھ مادی وجوہ ہیں۔ یعنی ہمارے ہاں لوہے اور کوئلے کی کمی ہے ہمیں غیر ملکی زرِ مبادلہ دوسری اقوام کی نسبت کم فراہم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا ایسی ہے کہ لوگ اچھی طرح محنت و مشقت نہیں کر سکتے۔ ہماری پٹ سن کی قیمت دنیا کی منڈیوں میں گر رہی ہے۔ ہمارے پہاڑوں پر درخت موجود نہیں اور اس بنا پر ہر سال سیلاب آ جاتے ہیں۔

اس سے ذرا آگے چل کر کہا ہے۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس عالمِ اسباب میں بھی قوموں کی قسمتوں کے فیصلے دنیاوی مال و متاع پر نہیں بلکہ اخلاقی بنیادوں پر کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کا مالک اور حاکم ہے۔ اس نے اس دنیا میں مادی وسائل کا انتظام تو کیا ہے اور ان میں علت و معلول کے محسوس رشتے بھی قائم فرمائے ہیں۔ مگر جن قوانین کے ذریعے وہ اس کائنات کا انتظام چلا رہا ہے۔ وہ مادہ کے بے حس اور میکانکی

ضابطے نہیں بلکہ اخلاقی اصول ہیں۔ اگر کسی قوم پر رزق تنگ کر دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ لازمی طور پر وسائل کی کمی یا سرمایہ کی قلت نہیں ہوتی جبکہ اب اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قدرتی ذرائع و وسائل کی فراوانی کے باوجود اس پر ذلت و مسکنت چھا جاتی ہے اور غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلند و بالا ذات مادی اسباب و نتائج سے یکسر بے پرواہ ہو کر کچھ دوسرے اصولوں کے تحت اس دنیا کا نظم چلا رہی ہے۔ مثلاً ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں قحط پڑ جائے تو اس کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے باشندوں نے فصل کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں یا آب پاشی کا معقول انتظام نہیں کیا جا سکا۔ اس لئے جب بھی اس کی روک تھام کی ہیں فکر لاحق ہوتی ہے تو ہماری توجہ پھر پھر کر مادی اسباب کی طرف ہی پلٹتی ہے۔

ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں۔ لیکن یہ سوال اس قدر اہم اور بنیادی ہے کہ ہمارے نزدیک اس پر بار بار لکھنے کی ضرورت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس موضوع پر پھر قلم اٹھایا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات کو آپ غور سے پڑھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان سے آپ کے ذہن پر کچھ اس قسم کا اثر مرتب ہوگا کہ مادی اسباب و ذرائع اور رجوع الی اللہ میں بُعد و مغائرت ہے۔ اگر انسان مادی اسباب کے پیچھے لگ جائے تو وہ خدا سے دور ہٹتا جاتا ہے۔ خدا اس کائنات کو مادی اسباب و نتائج سے یکسر بے پرواہ ہو کر "چلا رہا ہے اس لئے خدا کے بندوں کا بھی اسی قسم کا طرزِ عمل ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے مروجہ مذہب کے نظریات و تصورات پر مجوسی اثر جس قدر غالب ہے وہ تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں۔ جس ذہنیت کی جھلک مذکورہ بالا نظریہ میں پائی جاتی ہے وہ مجوسیت کی پیدا کردہ ہے۔ مجوسیوں کے ہاں تصور یہ تھا کہ کائنات میں دو مستقل بالذات قوانین کارفرما ہیں ـــ ایک اہرمن (شیطان) اور دوسرا یزداں (خدا) یہ دونوں قوتیں باہم گر نبرد آزما ہیں۔ اہرمن کا دائرہ مادی دنیا اور اس کے لوازمات ہیں۔ اور خدا کی مملکت روحانی اور اخلاقی دنیا سے متعلق ہے۔ لہٰذا جو شخص مادی اسباب و علائق کے پیچھے لگیگا وہ یزداں سے دور ہٹتا چلا جائے گا۔ بالفاظ دگر مادی اسباب و قوانین شیطان کے پیدا کردہ ہیں اور روحانی اور اخلاقی قوانین خدا کے وضع فرمودہ۔

یہی وہ نظریہ تھا جس نے ہندومت میں فلسفۂ ویدانت پیدا کیا (ہندومت تو ہے ہی ایران کے مجوسی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل) اسی نظریہ نے سینٹ پال کی عیسائیت کی تخلیق کی۔ اس نے پھر اسلام کو متاثر کیا۔ اور یہی متاثر شدہ اسلام آج ہمارا مروجہ مذہب ہے۔ جس کی شہادت مندرجہ بالا اقتباسات دے رہے ہیں۔ آپ ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے۔

غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلند و بالا ذات مادی اسباب و نتائج

سے یکسر بے پرواہ ہو کر کچھ دوسرے اصولوں کے تحت اس دنیا کا نظم چلا رہی ہے۔

اس سے نظر آ رہا ہے کہ اس ذہنیت کی رُو سے "مادی اسباب و نتائج" کسی غیر از خدا قوت کے حربے ہیں اور خدا کی بلند و بالا ذات ان سے یکسر بے پرواہ ہو کر اپنے اصولوں کے ماتحت اس دنیا کا نظم و نسق چلا رہی ہے۔ لہٰذا خدا کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی خدا کے اتباع میں اپنے معاملات کو "مادی اسباب و نتائج" سے یکسر بے پرواہ ہو کر خدا کے اصولوں کے مطابق طے کریں۔

یہ تصور یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے مادی اسباب و قوانین بھی اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے اخلاقی قوانین و اقدار متعین کی ہیں اور وہ خدا مادی کائنات کو (جو اُسی کی کائنات ہے) اپنے مادی قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ اس لئے جو لوگ مادی امور کو مادی قوانین کے مطابق سرانجام دیتے ہیں وہ بھی خدا کے قوانین کا اتباع کرتے ہیں۔ شیطان کے قوانین کا اتباع نہیں کرتے۔ مادی کائنات میں شیطان کا کوئی قانون کارفرما نہیں۔ اس میں سب قوانین خدا کے ہیں۔ دنیا کے عظیم توحید پرست حضرت ابراہیمؑ نے جب کہا تھا کہ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ. وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ (۲۶/۷۹-۸۰)۔ "اللہ وہ ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے" تو انہوں نے اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ یہاں جو کچھ مادی اسباب کے تحت ہوتا ہے وہ بھی خدا ہی کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ مادی اسباب سے غفلت یا اعراض برتتے ہیں یا ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو وہ خدا ہی کے قوانین سے پہلوتہی اور سرکشی کرتے ہیں اور اس کا خمیازہ بھگتتے ہیں۔

لیکن انسانی دنیا میں مادی قوانین کے علاوہ، اور قوانین بھی ہیں جن کا تعلق انسان کی "انسانیت" یا اس کی ذات سے ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ان قوانین کا تعلق صرف انسان کی انفرادی زندگی سے ہے۔ ان کا تعلق جس طرح ایک فرد کی ذات سے ہے اسی طرح افراد کی اجتماعی زندگی سے بھی ہے۔ قرآن انسان کی اجتماعی (معاشرتی، تمدنی، سیاسی) زندگی کی عمارت اسکی ذات کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ مثلاً قرآن نے عدل کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو شخص عدل کرتا ہے اس سے ایک طرف اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرہ اعتدال پر رہتا ہے۔ ان قوانین کی خلاف ورزی سے جہاں افراد کی ذات غیر نشوونما یافتہ رہ جاتی ہے وہاں معاشرہ میں بھی فساد برپا ہو جاتا ہے۔

مادی قوانین خداوندی کے اتباع سے مادی قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر معاشرہ کا نظام مستقل اقدار پر متفرع نہ ہو تو اس کا انجام تباہی و بربادی ہوتا ہے اور محض مادی اسباب اسے اس تباہی سے نہیں بچا سکتے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں قرآن نے مادی سامان و ذرائع کی فراوانی کے باوجود قوموں کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ رکھنا چاہیئے کہ اگر مادی قوانین خداوندی سے اعراض برتا جائے تو خالی "روحانی قوانین" قوم کو زندگی عطا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کتاب (ضابطۂ قوانین) کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتایا ہے (۲/۸۵)۔ اگر کتاب خداوندی کے مادی قوانین (صحیفۂ فطرت) پر ایمان ہے لیکن انسانی ذات سے متعلق قوانین (مستقل اقدار قرآن) سے انکار ہے، تو بھی نتیجہ تباہی ہوگا۔ اور اگر مستقل اقدار پر ایمان ہے، لیکن مادی قوانین سے انکار ہے تو یہی انجام بربادی ہوگا، یعنی

(۱) تہذیب مغرب میں، مادی قوانین پر ایمان اور مستقل اقدار سے انکار ہے۔ اس لئے نتیجہ تباہی ہے۔ یہ تباہی مادی قوانین پر ایمان کا نتیجہ نہیں بلکہ مستقل اقدار سے انکار کا نتیجہ ہے۔

(۲) مذہب میں (یعنی موسی تصورات کے پیدا کردہ نظریہ میں) مادی قوانین سے انکار اور "روحانی قوانین" پر ایمان ہوتا ہے اس کا بھی نتیجہ تباہی ہے۔ یہ تباہی مادی قوانین سے انکار کا نتیجہ ہوتی ہے (واضح رہے کہ مذہب میں "روحانی قوانین" کا تصور بھی قرآن کی

مستقل اقدار کا تصور نہیں ہوتا۔ اس لئے مذہب میں درحقیقت، مادی قوانین اور مستقل اقدار دونوں کا انکار ہوتا ہے۔ اس لئے اہلِ مذہب کی تباہی مغرب کے "مادہ پرست" کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک اور ذلت آمیز ہے)۔

(۳) اسلام (یعنی دینِ خداوندی) میں، مادی قوانینِ خداوندی اور مستقل اقدارِ خداوندی دونوں پر ایمان ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں کامرانیاں اور کامیابیاں قدم چومتی ہیں کہ دنیا اور آخرت دونوں سنور جاتے ہیں۔

اگر کسی ایسے خطۂ زمین میں جہاں اسلامی معاشرہ ہو سیلاب آجائے تو یہ خدا کے طبعی قوانین کے مطابق آئے گا اور اس کا تدارک بھی اُس کے طبعی قوانین کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن اگر سیلاب روکنے میں ایسا کیا جائے کہ غریبوں کے گھروں کو برباد کر کے امیروں کی زمینوں کو محفوظ رکھا جائے تو یہ مستقل قدر کی خلاف ورزی ہوگی جس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ اس کے برعکس، اگر ہر فردِ انسانیہ سے یکساں برتاؤ کیا جائے گا تو یہ قرآن کی مستقل قدر کا اتباع ہوگا (اسی کو رجوع الی اللہ کہا جاتا ہے) اور اس کا نتیجہ حقیقی مرفہ الحالی ہوگا۔

سیلاب روکنے کے لئے بند بنانا بھی قانونِ خداوندی کا اتباع ہے۔ اور تمام افرادِ انسانیہ سے یکساں برتاؤ کرنا بھی قانونِ خداوندی کی اطاعت۔

یہ ہے قرآن کا عطا کردہ تصورِ حیات جو صدیوں سے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

۲۔ بھارت کے مسلمان

تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرنے والا مذہب پرست طبقہ کہا کرتا تھا کہ ہندوستان کی متحدہ حکومت میں مسلمانوں کو پوری پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ اس لئے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے قیام کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کو کس قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے، اس کا اندازہ جن سنگھ کے قائد مسٹر گول والکر کے حسبِ ذیل الفاظ سے لگائیے۔ انہوں نے کہا۔

> جب ہم ہندو قوم کا لفظ بولتے ہیں تو بہتوں کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ بھارت میں رہنے والے اُن لوگوں کا کیا بنے گا جو اپنے آپ کو ہندو نہیں کہتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنے آپ کو ہندو کہنا چاہیئے اور ہندو روایات کو اپنا کر پورے فخر کے ساتھ آگے بڑھنا۔ یعنی وہ خدا، مسیح (علیہ السلام) یا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقۂ عبادت میں تو آزاد ہیں۔ لیکن عبادت کے علاوہ زندگی کے تمام معاملات کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اپنے طریقہائے عبادت سے حقیقی عقیدت ہے تو اپنے شخصی مذہب کی حیثیت سے اُن پر عمل کر سکتا ہے۔ لیکن اپنے خاندانی اور قومی مذہب کی پیروی کرتے ہوئے اُسے اپنے آپ کو ہندو کہنا چاہیئے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنی چاہیئے۔

(بحوالہ مدینہ بجنور۔ مورخہ ۲۱ ۱۲/۵۹)

اس پر اخبار مدینہ حسبِ ذیل اضافہ کرتا ہے۔

گول والکر جی نے مندرجہ بالا الفاظ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے تجربہ شاہد ہے کہ ہماری کانگرسی حکومتیں اور ہمارے کانگرسی لیڈروں کی اکثریت دل سے اسی کی قائل ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ زبان سے اس کا اقرار نہیں کیا جاتا۔

سوچئے کہ اگر پاکستان وجود میں نہیں آتا تو آج ہمارا حشر کیا ہوتا؟

۳۔ شخصیت پرستی کے خلاف

محترم عبدالماجد صاحب کے ہفتہ وار جریدہ صدق (لکھنؤ) کی ۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں "ایک صحیح معیار" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا ایک جملہ ان کے ایک مقالے سے جس کا اردو ترجمہ حال میں شائع ہوا ہے۔ "اللہ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا جس سے دین و دنیا کی درستی نہ ہوتی ہو۔ خواہ اس کے کرنے والے اتقیاء و صلحاء اور اہلِ جنت ہی کیوں نہ ہوں"۔ اُمت یہی سبق تو بالکل بھولے ہوئے ہے۔ اور بجائے کسی فعل پر اس کے ذاتی حسن و قبح کے لحاظ سے نظر کرنے کے۔ اسے یاد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اگر فاعل کی شخصیت مقدس و برگزیدہ ہے تو فعل لازمی طور پر اچھا ہی ہوگا اور اگر فاعل اس کے برعکس ہے تو اس کا ہر قول و فعل لازماً قابلِ لعنت و مستحقِ ملامت ہی ہوگا۔ شخصیتوں کو اگر ان کے مناسب مقام پر محدود رکھنے کی عادت عام ہو جائے تو سینکڑوں ہزاروں غلط فہمیوں سے نجات بلا دقت حاصل ہو سکتی ہے۔"

محترم دریابادی صاحب کا یہ پند کس قدر بلند اور درست ہے! اس کے متعلق کچھ لکھنا بے کار لیکن ان حضرات کا خود اس پر کس حد تک عمل ہے اس کا اندازہ لگانا ہو تو کسی ایسے بزرگ کے کسی قول یا فعل پر تنقید کیجئے جو ان کے نزدیک مقدس اور برگزیدہ ہوں، اور پھر دیکھئے کہ آپ کا حشر کیا ہوتا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ ان حضرات کی ساری عمر پند و نصائح میں گذر جاتی ہے لیکن اس پر عمل کوئی نہیں کرتا۔

۴۔ دلآزار کتابیں

آجکل اخبارات میں بعض دلآزار مذہبی کتابوں کا عجیب و غریب سرخیوں کے ساتھ چرچا ہو رہا ہے۔ ہوا یوں کہ کسی صاحب نے ایک کتاب شائع کر دی جس سے ایک طبقہ کے جذبات مجروح ہوئے۔ اس کے جواب میں اس طبقہ کی طرف سے (ایک کے مقابلہ میں چار) کتابیں ایسی شائع ہو گئیں جو اُس کتاب سے کہیں زیادہ دلآزار اور منافرت انگیز ہیں۔ اس پر صلح پسند طبقہ کی طرف سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ اس سلسلہ کو ختم کیا جائے۔

دلآزار کتابوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ کچھ آج کی پیداوار نہیں۔ یہ عرصہ سے جاری ہے۔ ان کے خلاف جس شدت سے بھی صدائے احتجاج بلند کی جائے وہ برحق اور قابلِ فہم ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح صدائے احتجاج بلند کرنے سے یہ سلسلہ رک سکتا ہے؟ اس سلسلہ کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ سطح سے ذرا نیچے اتر کر ان سرچشموں کو تلاش کیا جائے جہاں سے اس قسم کی

کتابوں کو جنم ملتا ہے۔

آپ ان کتابوں کو دیکھئے۔ (بجز مستثنیات جن میں مصنف نے کچھ اپنی طرف سے لکھا ہو) ان میں اکثر و بیشتر ان کتابوں کے اقتباسات ہوتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم تک منتقل ہو کر آئی ہیں۔ ہم اسلاف کی ان کتابوں کو اپنے کتب خانوں کی زینت بناتے ہیں۔ ان کی نشر و اشاعت کو کارِ خیر سمجھتے ہیں۔ اس "کارِ خیر" میں ہزاروں۔ لاکھوں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ مکتبوں اور دارالعلوموں میں ان کا درس دیتے ہیں۔ محفلوں اور مجلسوں میں ان کے چرچے کرتے ہیں۔ منبر و محراب سے ان کے تذکرے سنائی دیتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص انہی کتابوں میں سے مواد جمع کر کے نئی کتاب شائع کر دیتا ہے تو اس کے خلاف شور و غوغا بلند کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں کتاب کو ضبط کرنے کے ریزولیوشن پاس ہوتے ہیں۔ کہیں مصنف کے خلاف کارروائی کرنے کے مشورے دیئے جاتے ہیں۔ غرضیکہ معاشرہ میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے جو اکثر و بیشتر اس کتاب کی ضبطی پر منتج ہوتا ہے۔

اس کتاب کو تو ہم ضبط کرا دیتے ہیں لیکن جن کتابوں کے اقتباسات پر وہ کتاب مشتمل تھی ان کی نشر و اشاعت کا "کارِ خیر" بدستور جاری رہتا ہے۔ سوچئے کہ کیا اس طرح اس قسم کی کتابوں کا سلسلہ ختم ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی کتاب اپنے مندرجات کی بنا پر قابلِ ضبطی ہے تو وہ کتابیں قابلِ ضبطی کیوں نہیں جن سے وہ اقتباسات لئے گئے ہیں؟ کیا وہ محض اس لئے قابلِ ضبطی نہیں کہ وہ آج سے دو چار سو سال پہلے لکھی گئی تھیں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات اصل کتاب کا کوئی مضمون فی ذاتہٖ قابلِ اعتراض نہ ہو لیکن اس کے اقتباس کو غلط انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ لیکن یہ بھی مستثنیات میں سے ہو گا۔ اکثر و بیشتر وہ اقتباسات بجائے خویش قابلِ گرفت ہوں گے۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ (بجائے اس کے کہ اس قسم کی جدید کتابوں کے خلاف واویلا مچایا جائے) ان پرانی کتابوں کو کنگھالا جائے اور ان میں جو چیزیں قابلِ اعتراض ہوں (خواہ وہ کسی فرقے سے متعلق ہوں) انہیں خارج کر دیا جائے، یا ان کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے جس طبقہ کا معاش ہی اس قسم کی ہنگامہ خیزیوں سے وابستہ ہو اور جس کا دین "فی سبیل اللہ فساد" ہو وہ ان کتابوں کو ہاتھ کب لگانے دے گا؟ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہو گا وہ جب بھی وجود میں آئی ضرور ایسا کرے گی۔

۵۔ امن قائم کرنے کے داعی

محترم امین احسن اصلاحی صاحب اپنے حج کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے (اپنے ماہنامہ میثاق بابت جنوری ۱۹۶۰ء میں) لکھتے ہیں۔

اسی دوران میں ایک روز جلالۃ الملک اپنے وزراء اور حکام کے ساتھ طواف کے لئے تشریف لائے۔ جو دن ان کے طواف کے لئے مقرر تھا، اس دن صبح ہی سے حرم اور اس کے قرب و جوار میں فوجی دستے نظر آنے لگے عصر کے وقت میں نے دیکھا کہ حرم کی چھتوں، اس سے متصل سڑکوں، اور حرم کے تمام گوشوں اور کونوں میں فوج کے آدمی کھڑے ہیں۔ عصر اور مغرب کی نمازوں کے درمیان میں نے اپنے ایک طواف کا وقت مقرر کر رکھا تھا، اس

جو پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج اسی وقت جلالۃ الملک طواف کریں گے۔ اگلا زمانہ ہوتا تو ایک بادشاہ اور ایک گداگر دونوں بغیر کسی زحمت کے ایک ہی وقت میں طواف کر سکتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں تو اس چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب میں نے دیکھا کہ آج میرے طواف کا موقع نہیں ہے تو مطاف کے پلیٹ فارم پر بادشاہ کے طواف کی سیر کے لئے کھڑا ہو گیا۔ مطاف اور مطاف میں داخل ہونے کا ایک طرف کا راستہ عام آدمیوں سے بالکل خالی کرا لیا گیا تھا۔ راستہ اور مطاف کو ہر طرف سے نجدی فوج کے سپاہیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پہلے جلالۃ الملک کے کچھ مقربین آئے اور وہ کچھ دیر تک طواف کرتے رہے۔ اس کے بعد جلالۃ الملک، ان کے وزراء اور اعلیٰ حکام آئے اور انھوں نے طواف کیا۔ طواف کے بعد جلالۃ الملک اور ان کے ساتھیوں نے مغرب کی نماز حرم میں پڑھی۔ پہلی رکعت کے سجدے سے جب میں نے سر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ہر طرف سے کچھ مسلح فدائی ہوئے اثنائے نماز میں بھی صفوں کے درمیان جلالۃ الملک کی نگرانی کر رہے ہیں۔

یہ اُس ملک کے بادشاہ کا حال ہے جس کے متعلق ڈھنڈورے پیٹے جاتے ہیں کہ وہاں قانونِ شریعت کے نفاذ سے امن کی یہ کیفیت ہے کہ انسان یہاں سے وہاں تک بلاخوف وخطر اکیلا سفر کر سکتا ہے! یاد رکھیے۔ تعزیری احکام سے امن قائم نہیں ہوا کرتا امن قائم ہوتا ہے صحیح قرآنی نظام کے قیام سے۔ اُس نظام کے تابع خدا کا یہ وعدہ پورا ہوتا ہے کہ

مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۳/۹۸)

جو وہاں داخل ہو گیا اسے امن کی ضمانت مل گئی۔

―――――×―――――

۶۔ دین سے مذاق

حسب ذیل اقتباسات کو ذرا غور سے پڑھیئے۔

اتنی مختلف سندوں سے جو بات محدثین کو پہنچی ہو۔ اس کے متعلق یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ بالکل ہی بے اصل ہو گی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کو سمجھنے میں حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا وہ پوری بات سن نہیں سکے ہوں گے...... اس قسم کی غلط فہمیوں کی مثالیں متعدد روایات میں ملتی ہیں جن میں سے بعض کو دوسری روایات نے صاف کر دیا اور بعض صاف ہونے سے رہ گئیں۔ زبانی روایتوں میں ایسا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

دوسرا ―――

لہٰذا ابوہریرہؓ۔ تو ان پر ہم یہ شک تک نہیں کر سکتے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی غلط بات منسوب کریں گے۔ لیکن ہمارے لئے ان راویوں کو جھوٹا ماننا جس قدر مشکل ہے اس سے بدرجہا زیادہ مشکل یہ باور کرنا ہے کہ ایک نبی نے جھوٹ بولا ہوگا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ ایک نبی پر دروغ گوئی کا الزام لگایا

ہوگا۔ اس لئے لامحالہ ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس معاملہ میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جس کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح طور پر نقل نہیں ہوا۔

تیسرا ــــ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کسی چیز کی نہی کا حکم نہ مل جاتا آپ پہلے کے رائج شدہ طریقوں کو منسوخ نہ فرماتے بلکہ یا تو ان کے رواج پر سکوت فرماتے یا بوقت ضرورت ان کی اجازت بھی دے دیتے۔ چنانچہ یہی صورت متعہ کے بارے میں پیش آئی۔ ابتداءً آپ نے اس کے رواج پر سکوت فرمایا۔ اور بعد میں کسی جنگ یا سفر کے موقع پر اگر لوگوں نے اپنی شہوانی ضرورت کی شدت ظاہر کی تو آپ نے اسکی اجازت بھی دے دی۔ کیونکہ حکم نہی اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ پھر جب حکم نہی آگیا تو آپ نے اس کی قطعی ممانعت فرما دی[1]۔ لیکن یہ حکم تمام لوگوں تک نہ پہونچ سکا۔ اور اس کے بعد بھی بعض لوگ ناواقفیت کی بنا پر متعہ کرتے رہے آخر کار حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس حکم کی عام اشاعت کی اور پوری قوت کے ساتھ اس رواج کو بند کیا۔

چوتھا ــــ

یہ بات حکمت تبلیغ کے خلاف ہے کہ مبلغ اپنے زمانے میں جو علم اشیاء موجود ہو اس کو چھوڑ کر وہ ہزار ہا سال بعد کے علم اشیاء کو تعلیم حقیقت کا ذریعہ بنائے۔ اسے جن حقائق کو ذہن نشین کرانا ہوتا ہے۔ ان کی تفہیم کے لئے اس کو لامحالہ اپنے زمانے ہی کے مواد علمی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ اگر ان معلومات سے کام لے جو صدیوں بعد انسان کے علم میں آنے والی ہوں تو اس کے معاصرین اس کی اصل تعلیم کو چھوڑ کر اس بحث میں لگ جائیں گے کہ یہ شخص کس علم کی باتیں کر رہا ہے۔ اور ان میں کا ایک شخص بھی اس کی تبلیغ سے متاثر ہو کر نہ دے۔

سوچئے کہ یہ خیالات کس شخص کے ہو سکتے ہیں؟ آپ بالکل نہیں بتا سکیں گے۔ لیکن اگر آپ حضرات علمائے کرام میں سے کسی سے پوچھیں گے تو وہ جھٹ کہہ دیں گے کہ یہ منکرین حدیث کے ٹولہ کا کوئی فتنہ پرداز ہے جنھوں نے شانِ رسالت کا (معاذ اللہ) استخفاف اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔ اور وہ اس قسم کی باتوں سے احادیث نبویؐ کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب آپ معارف التسنیم کا حدیث نمبر اٹھا کر دیکھیں گے (جو ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو شائع ہوا تھا) تو یہ دیکھ کر آپ کی حیرت کی انتہا نہیں رہے گی کہ یہ ارشادات مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ہیں جو اپنے آپ کو عوام میں احادیث کا بہت بڑا علمبردار کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ آپ نے تماشا دیکھنا ہو تو آپ انہی خیالات کو بغیر نام لئے (سابق) جماعت اسلامی کے کسی حامی کے سامنے پیش کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ کس طرح آپ کو منکر حدیث اور منکر رسالت قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب آپ (بعد میں) بتائیں کہ یہ تو خود مودودی صاحب کے خیالات ہیں تو ان کی طرف سے گھٹ سے

---

[1] لیکن مودودی صاحب اسے اب بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

جواب آئے گا کہ انھیں سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے — حالانکہ آپ اصل مضمون میں دیکھیں گے کہ انھیں سیاق و سباق سے الگ نہیں کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ مودودی صاحب (اپنے دیگر ہم پیشہ حضرات کی طرح) عجیب مصیبت میں گرفتار ہیں ان کی جماعت میں کثرت جہلا کی ہے جنھیں خوش رکھنے کے لئے انھیں ٹھیٹھ قدامت پرست ملّا کا لبادہ اوڑھنا پڑتا ہے۔ لیکن دوسری طرف جماعت میں کچھ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ہے۔ انھیں ساتھ رکھنے کے لئے مودودی صاحب کو ماڈرن بننا پڑتا ہے۔ جب ان کا رخ جہلا کی طرف ہوتا ہے تو ان کا ارشاد ہوا ہوتا ہے کہ احادیث نبویؐ، قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل (مثلہ معہ) وحی منزل من اللہ ہیں۔ حضورؐ اپنی بعثت کے اولین سانس سے لیکر اپنی زندگی کے آخری سانس تک ہر آن اور ہر حال میں نبی تھے اس لئے حضورؐ کی ہر بات خدا کی وحی تھی۔ اس لئے احادیث نبویؐ پر اسی طرح ایمان ضروری ہے جس طرح قرآن کریم پر۔ لیکن جب تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بعض ایسی احادیث پیش کی جائیں جن پر ان کے خیال میں اعتراض وارد ہوتا ہو، تو انھیں خوش کرنے کے لئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ جب تک رسول اللہؐ پر وحی نہیں آتی تھی آپ مروجہ باتوں کو علیٰ حالہ رہنے دیتے تھے۔ اور تبلیغ کی خاطر اپنے مخاطبین کی ذہنی اور علمی سطح کے مطابق گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ پھر صحابہؓ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ وہ کسی بات کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ لیتے تھے۔ اور بعض باتوں میں انھیں غلط فہمی بھی ہو جاتی تھی۔ زبانی روایات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ہوتی ہے ان لوگوں کی حالت جو دین کو اپنی مفاد پرستیوں کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات کا پس منظر یہ ہے کہ "تسنیم" کے حدیث نمبر میں "مودودی صاحب" کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔

"چند احادیث کے اشکالات اور ان کی صحیح تاویل"

مضمون کی ابتدا میں جو نوٹ دیا گیا ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ

"حال میں منکرین حدیث کی جانب سے ایک پمفلٹ شائع کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے "خود فیصلہ کیجئے"
اس رسالہ میں صحیح البخاری کی متعدد احادیث چھانٹ کر جمع کی گئی ہیں اور آخر میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ "کیا ایسی احادیث رسول اللہؐ کی ہو سکتی ہیں؟"

مودودی صاحب نے ان احادیث پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ مثلاً بخاری کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک روز کہا کہ میں سو عورتوں یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شہسوار پیدا کریں گی۔ لیکن ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور وہ بھی آدھا بچہ جنی۔

مودودی صاحب کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یا تو حضرت ابوہریرہؓ کو نبی اکرمؐ کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی اور یا وہ پوری بات سن نہیں سکے۔ (اقتباس ۱)

دوسری حدیث یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ (معاذ اللہ) جھوٹ بولا تھا۔ اس کے جواب میں اقتباس ۲۔

ملاحظہ فرمائیے۔

تیسری حدیث یہ ہے کہ آپ نے ایک جنگ میں لوگوں کو متعہ کی اجازت دی تھی۔ اس کا جواب اقتباس ۳۲ میں دیا گیا ہے۔

چوتھا اقتباس اس حدیث کے سلسلہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ سورج غروب ہو جانے کے بعد خدا کے عرش کے نیچے چلا جاتا ہے۔ اور جب اسے دوسری صبح طلوع ہونے کی اجازت ملتی ہے تو پھر نمودار ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ایک طرف احادیث کی پوزیشن یہ بتانا (جو ان اقتباسات میں بتائی گئی ہے) اور دوسری طرف یہ کہ احادیث خدا کی طرف سے نازل کردہ وحی ہیں اور جو انھیں ایسا نہیں مانتا وہ منکرِ رسالت ہے۔ دین سے مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

یاد رکھئے۔ صحیح پوزیشن یہ ہے کہ

(۱) وحیٔ خداوندی تمام و کمال قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جس کا ایک ایک لفظ غیر متبدل ہے۔

(۲) احادیث وہ اقوال و اعمال ہیں جنھیں رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ صحیح اور غلط کا معیار یہ ہے کہ جو باتیں قرآنِ کریم کے خلاف ہیں یا جن سے رسول اللہ کی ذاتِ اقدس پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن وارد ہوتا ہے وہ حضورؐ کی طرف غلط منسوب ہیں۔

۷۔ اطاعتِ رسولؐ

ہمارا قدامت پرست طبقہ یہ کہتا ہے کہ اطاعتِ رسولؐ کا عملی طریق یہ ہے کہ جو احادیث ہماری کتابوں میں درج چلی آرہی ہیں انھیں دین کا غیر متبدل ضابطہ تسلیم کیا جائے اور مستقل قوانین کی حیثیت سے ان کی اطاعت کی جائے۔ اس نظریہ کی رُو سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور جن کے مطابق یہ متعین ہی نہیں کیا جا سکتا کہ دین کسے کہا جائے ان پر تفصیلی بحث طلوع اسلام کے صفحات پر برسوں سے ہوتی چلی آرہی ہے۔ ان میں اب دو باتوں کا اور اضافہ ہوا ہے۔

(۱) مودودی صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ حکمتِ عملی کا تقاضہ پورا کرنے کے لئے (توحید و رسالت کو چھوڑ کر) دین کے ہر اصول کو توڑا جا سکتا ہے۔ اور اپنے اس دعوے کی تائید میں یہ چیز پیش کی کہ نبی اکرمؐ ساری عمر مساواتِ انسانیہ کا سبق دیتے رہے لیکن جب تشکیلِ مملکت کا وقت آیا تو آپ نے (معاذ اللہ) فیصلہ صادر فرمایا کہ خلافت قریش میں رہے گی۔ اس طرح آپ نے (پناہ بخدا) حکومت کو اپنے قبیلے میں محدود کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس حدیث نے (کہ خلافت قریش میں رہے گی) اُس حدیث کو منسوخ کر دیا کہ جس میں کہا گیا ہے کہ عربی کو عجمی پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔

یعنی پہلے اِن حضرات نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ قرآن کی بہت سی آیات بھی منسوخ ہیں۔ بعض وقت قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اور بعض وقت ایک حدیث، قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔

اب ان کا یہ ارشاد ہے کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث بھی منسوخ کر دیتی ہے! اور جب اِن سے پوچھا جائے کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں حدیث منسوخ ہے اور فلاں ناسخ، تو جواب ملتا ہے کہ اس کا فیصلہ "مزاج شناسِ رسول" کرے گا۔

(۲) اب اسی مکتبِ فکر کے دوسرے فرد، امین احسن اصلاحی نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

ایک مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں (بڑا باریک) فرق ہوتا ہے۔

(میثاق دسمبر ۵۹ء۔ ص ۳۱)

اس کے بعد انھوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ نے جو فرمایا تھا کہ خلافت قریش میں ہوگی، تو یہ ایک مستقل حکم نہیں تھا بلکہ ایک قضیہ کا فیصلہ تھا۔

لیجئے! اب ایک اور قصہ کھڑا ہو گیا۔ یعنی ہماری کتبِ احادیث میں ایسی احادیث بھی ہیں جو مستقل حکم رکھتی ہیں اور ایسی بھی جو صرف ہنگامی فیصلوں کے لئے تھیں۔ امت کے لئے مستقل حکم کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔

فرمایئے! کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں حدیث، ہنگامی حکم کی حیثیت رکھتی ہے اور فلاں دوامی حکم کی حیثیت! اسی حدیث (الائمۃ من قریش) کے متعلق مودودی صاحب کا فیصلہ ہے کہ یہ مستقل حکم کی حیثیت رکھتی ہے اور اصلاحی صاحب کا ارشاد ہے کہ یہ ہنگامی فیصلہ تھا۔

آپ نے دیکھا کہ دین کے متعلق ایک بنیادی غلط فہمی انسان کو کن کن الجھنوں میں پھنسا دیتی ہے! یاد رکھئے۔ "اطاعت" کے سلسلہ میں جب تک آپ اس قرآنی نظریہ کو قبول نہیں کریں گے جس کی دعوت طلوعِ اسلام دیتا چلا آرہا ہے، آپ ان خار دار جھاڑیوں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے اور وہ نظریہ یہ ہے کہ

(۱) رسول اللہ کی وفات کے بعد، خلافت علیٰ منہاجِ رسالت (یعنی وہ مملکت جو قرآن کے خطوط پر تشکیل ہو) کی اطاعت، رسول کی اطاعت کے قائمقام ہو جاتی ہے۔ اور

(۲) ہر وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہو، وضعی ہوتی ہے۔

وذالك الدين القيم۔

۸۔ ایک ضروری احتیاط

قرآن کریم کے جو نسخے آجکل چھپ رہے ہیں ان میں (بعض میں) یہ دیکھا گیا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے آخر میں، وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے ساتھ ہی (اسی رسم الخط اور قلم سے) "آمین" بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس سے ناواقف مسلمان (غالباً) اور غیر مسلم (یقیناً) اس نتیجے پر پہونچ سکتے ہیں کہ "آمین" بھی سورۂ فاتحہ ہی کا ایک حصہ ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ "آمین" قرآن کا لفظ نہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم کے ناشرین کو اس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے لکھا کہ "فیروز سنز" (لاہور) کی طرف سے قرآنِ کریم کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔ ہم نے اس پر "میسرز فیروز سنز (لاہور) کی توجہ اس طرف دلائی ان کا جواب موصول ہوا ہے (بذریعہ چٹھی نمبری FS/6/TR/3520۔ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۵۹ء) کہ "آئندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا"۔ فھو المراد۔

اسلام — کی — سرگزشت

(مسلسل)

معتزلہ کا درمیانی موقف

معتزلہ نے خوارج اور مرجیئہ کے مابین ایک درمیانی موقف اختیار کیا جو نہ بہت سخت تھا اور نہ بہت نرم و گداز — خصوصیت کے ساتھ واصل اور اس کے متبعین نے — دو درجوں کے درمیان ایک درجہ کا اعتراف کیا۔ یعنی بالفاظ دیگر خوارج اور مرجیئہ کے مابین ایک درمیانی راہ اختیار کی۔ انھوں نے کہا کہ مرتکب کبیرہ نہ تو مؤمن ہے کیونکہ ایمان سے مراد وہ فضائل خیر ہیں کہ جب کسی آدمی میں جمع ہو جائیں تو اسے مومن کہا جاتا ہے۔ یہ مدح کا نام ہے۔ اور فاسق میں وہ خصائل خیر جمع نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ مدح کا مستحق ٹھیرتا ہے لہٰذا اسے مومن نہیں کہا جا سکتا وہ مطلق کافر بھی نہیں ہے۔ کیونکہ شہادت اور باقی اعمالِ خیر اس میں موجود ہیں جن کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

سابقہ ہر دو اقوال کی طرح اس قول کے ماتحت بھی نہایت اہم سیاسی آراء آجاتی ہیں۔ معتزلہ کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنے اس نظریہ کو ان تمام اعمال پر تطبیق دے کر جو مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے کے بعد سے کئے گئے تھے بتائیں کہ فریقین میں سے کونسا فریق خطاکار تھا۔ حضرت عثمانؓ یا ان کے قاتلین؟ واقعۂ جمل میں حضرت علیؓ برحق تھے یا حضرت عائشہؓ؟ ہم ان لوگوں کے متعلق کیا فیصلہ کریں جن کے ہاتھوں میں جنگِ صفین میں لڑائی کی باگ ڈور تھی؟ ان میں سے مرتکب کبائر کونسا فریق تھا؟ اور ان میں سے کسے دراصل فاسق شمار کیا جائے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کے اعمال کی تحلیل کرنے، ان پر تنقید و تبصرہ کر کے ان پر حکم لگانے میں فرقۂ معتزلہ سب سے زیادہ جری واقع ہوا تھا۔ مرجیئہ نے تو فیصلہ دینے اور حکم لگانے سے قطعاً احتراز برتا۔ کیونکہ ان کے مسلک کا یہی تقاضا تھا۔ خوارج نے اگرچہ فیصلے کئے اور حکم لگائے مگر وہ چند مسائل مثلاً تحکیم، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ وغیرہ — تک ہی محدود تھے۔[1] رہ گئے

---

[1] کہا جاتا ہے کہ صحابہ پر تنقید کرنے میں معتزلہ سے بھی بڑھ کر شیعہ بڑے جری تھے کیونکہ وہ اس حد تک پہنچ گئے جہاں تک معتزلہ نہیں پہنچ سکے یہ بات صحیح ہے لیکن شیعہ خاص صحابہ پر ہی تنقید کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد حضرت علیؓ اور ان کی آل کی شان بلند کرنا ہوتا ہے۔ لیکن معتزلہ نے کو ایک میزان سے وزن کیا ہے اور جانبداری سے کام نہیں لیا۔

معتزلہ تو ان کو عام احکام پر فیصلے دینا پڑے۔ اور بہت سے صحابہؓ کے متعلق حکم لگانا پڑا۔ مثلاً ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عمرو بن العاصؓ، ابو ہریرہؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ وہ نہایت صراحت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ واصل بن عطاء حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ کی شہادت سبزی کی ایک گٹھی پر بھی قبول کرنے کو جائز قرار نہیں دیا۔ اور کہا ہو سکتا ہے حضرت علیؓ اور حضرت عثمان دونوں غلطی پر ہوں[1] عمرو بن عبید نے ابو ہریرہؓ کو برا بھلا کہا اور ان کی روایت میں طعن کیا۔ غرضیکہ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ یہاں ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس موضوع پر معتزلہ کی ان سیاسی آرا کے مقابلہ میں دولتِ امویہ کا موقف کیا تھا؟

معتزلہ کے سلسلہ میں بنو امیہ کا موقف

جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ بنو امیہ نے صحابہ پر تنقید کرنے میں معتزلہ کی اس جرأت کو اپنے لئے ایک قسم کی تائید ہی سمجھا۔ اس تائید سے بھی زیادہ جو مرجیئہ سے ان کو حاصل ہوئی تھی۔ کیونکہ مرجیئہ کی تائید ـــــ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ـــــ محض ایک سلبی تائید تھی۔ کیونکہ انھوں نے ان جماعتی اختلافات کو بغیر تنقید اور بغیر تحلیل و تجزیہ کے چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات حضرت علیؓ اور ان کے متبعین کی تائید میں بھی جاتی تھی اور حضرت معاویہؓ اور ان کے متبعین کی تائید میں بھی۔ لیکن اگر اس کے ساتھ اس حقیقت کو ملا لیا جائے کہ اس عہد میں جمہور مسلمانوں کا دینی شعور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کی رفعت شان کا کس حد تک معترف تھا تو ہم اس اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بالواسطہ طور پر فرقہ مرجیئہ کی یہ فکر شیعانِ علیؓ کے حق میں زیادہ جاتی تھی اور بنو امیہ کے لئے بہت ہی ضعیف قسم کی تائید کیا کرتی تھی۔ لیکن معتزلہ کی تائید ان کے حق میں زیادہ قوی تھی۔ کیونکہ مخالف گروہ پر تنقید اور تحلیل و تجزیہ کی کسوٹی پر رکھ دینے اور ان کے حق میں یا ان کے خلاف عقل و شعور سے فیصلہ دینے سے ـــــ کم از کم ـــــ تقدیس کا وہ نظریہ تو ختم ہو جاتا تھا جو اس عہد کے مسلمانوں میں حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے سلسلہ میں عام طور پر شائع تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ معتزلہ نے امیر معاویہ اور ان کے ہواخواہوں پر کچھ ہلکی تنقیدیں نہیں کیں بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ انھوں نے سب سے زیادہ امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ سے برأت کی ہے[2] عمرو بن عبید نے تو عمرو بن العاصؓ اور امیر معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کو خائن تک کہا اور ان پر مال فے میں چوری کرنے کا الزام لگایا۔ لیکن بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اموی خلفاء نے اس میں بھی اپنا فائدہ زیادہ اور خسارہ کم محسوس کیا۔ اس سے ـــــ کم از کم ـــــ اتنا تو ہوا کہ امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے دونوں تنقید کی ایک میزان میں تو آ گئے۔ بلکہ اکثر امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد کا پلڑا جھک جاتا تھا کیونکہ حکومت تو ان کی ہی تھی۔ عام لوگ ان پر تنقید کرنے سے ڈرتے بھی تھے اور دوسروں پر تنقید کرنے میں انھیں کوئی باک نہیں ہوتا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ابن کیسان اصم کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ تر اعمال میں حضرت علیؓ کی غلطی نکالتے تھے اور بعض اعمال میں امیر معاویہؓ کی تصویب کرتے تھے[3]۔ ہمارے پاس اپنی اس

---

[1] الشہرستانی ج ۱ صہ ۶۱ نیز عبدالقاہر بغدادی کی کتاب "اصول الدین" صہ ۳۰۷-۳۳۵ [2] المنیۃ والامل صہ ۶

[3] المنیۃ والامل صہ ۳۳

رائے کی دو دلیلیں ہیں۔

(اول) کتب تاریخ میں جواب تک ہمارے مطالعہ میں آئی ہیں ہمیں کہیں ایسا اشارہ تک نہیں ملتا کہ معتزلہ کے ائمہ مثلاً واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید اور دیگر رہنماؤں کو ان کے اس مسلک اور اس موضوع پر اپنی آراء کے اظہار کی وجہ سے خلفائے بنو امیہ اور ان کے گورنروں کی طرف سے کسی آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا ہو۔ بلکہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ معتزلہ ہی نے خلیفہ اموی ولید کے خلاف بغاوت کی ـــــ جب وہ شعائر اسلامی کی توہین کرنے میں بہت مشہور ہو گیا تھا ـــــ اور بعض معتزلہ نے ـــــ جن میں خود عمرو بن عبید بھی تھے ـــــ ولید کے خلاف جنگ میں یزید کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ جب یزید کامیاب ہو گیا اور خلیفہ بنا تو اس نے معتزلہ کی ان خدمات کا اعتراف کیا اور انہیں اپنا مقرب خاص بنا لیا۔ جس کی وجہ سے اس کے دورِ حکومت میں معتزلہ کی شان کافی بڑھ گئی

(دوم) اور یہ دلیل بڑی اہم ہے۔ مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ خلفائے بنو امیہ میں سے بعض آخری خلفاء مثلاً یزید بن ولید اور مروان بن محمدؒ نے مذہب اعتزال کو قبول کر لیا تھا اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مذہب اعتزال اگر ان کی حکومت کو کمزور کرتا اور ان کے دشمنوں کی تائید کرتا تھا تو وہ اس مذہب کو کیسے قبول کر سکتے تھے؟

معتزلۂ قرنِ اوّل و قرنِ ثانی میں مشابہت

شاید ہم ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ابتدائی عہد کی جماعت معتزلہ میں جو برسرِ جنگ دونوں گروہوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ یعنی اولاً حضرت علیؓ سے بھی اور حضرت عائشہؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیر سے بھی اور بعد میں حضرت علیؓ سے بھی اور امیر معاویہؓ سے بھی۔ ان میں اور اس دوسری معتزلہ جماعت میں جس کی رائے یہ تھی کہ خوارج کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ فلاں آدمی کافر ہے۔ اس سے جنگ کی جائے اور مرجیہ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ نرمی اور تساہل کا برتاؤ کیا جائے۔ بہرحال ان دونوں میں ایک طرح کی وجہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ ابتدائی معتزلہ اور ثانوی دور کے معتزلہ کی دونوں جماعتیں اس میں شریک تھیں کہ دونوں نے ایک الگ راستہ اختیار کیا جو ان تمام راستوں سے مختلف تھا جو ان کے زمانے میں مختلف گروہ اختیار کئے ہوئے تھے اور دونوں فرقے اپنی بنیادی تعلیمات میں ایک سیاسی اور دینی پہلو کو پیش کرتے تھے۔ اگرچہ ثانوی دور کے فرقہ معتزلہ نے آگے چل کر بہت سی خالص دینی ابحاث کا اضافہ بھی کر لیا جیسے صفاتِ خداوندی کے بارے میں ان کی مجرد بحث کہ وہ جسم ہے نہ عرض ہے..... الخ اس سے ہمیں ـــــ بلاشبہ ـــــ اس قول کو تسلیم کرنا پڑتا ہے جو اس رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ ان لوگوں کو معتزلہ اس لئے کہا گیا تھا کہ وہ امت کے عام عقیدہ سے الگ ہو گئے تھے۔ یعنی انہوں نے اپنے لئے ایک نیا راستہ بنایا تھا۔ جس پر وہ تنہا باقی سب لوگوں کے خلاف چلتے تھے۔ ان کو معتزلہ کہنے کی وجہ ان کا ایک ستون سے دوسرے نئے ستون کی طرف چلا جانا نہیں تھا۔ اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو یہ محض ایک رمز تھا جس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ وہ ان تمام موجودہ فرقوں سے الگ ہو کر ایک نیا فرقہ بنا رہے ہیں۔

خود معتزلہ اپنے اس لقب کو پسند نہیں کرتے تھے

کچھ بھی ہو، بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اکثر معتزلہ اپنے لئے اس نام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ خود کو "اہل العدل والتوحید" کہتے تھے۔ "اہل التوحید" تو اس لئے کہ وہ اللہ کی صفات کی نفی کرتے تھے۔ اور صفات کا قائل ہونے کو متعدد خداؤں کے وجود کا باعث خیال کرتے تھے۔ رہ گیا "اہل العدل" تو وہ اس لئے کہ وہ خدا کو ان تمام باتوں سے منزہ قرار دیتے تھے جو ان کے مخالفین کہتے تھے کہ اللہ نے بندوں کے لئے معاصی کو خود ہی مقرر کردیا اور پھر ان کو عذاب دینے لگا۔ اس کے برعکس انھوں نے کہا کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے اسی وجہ سے وہ جو کچھ کرتا ہے اسے اس پر عذاب دیا جائے گا اور یہی عدل کا تقاضا ہے۔

واصل بن عطا اور عمرو بن عبید

اعتزال کی طرف ابتدائی داعیوں میں سے واصل بن عطا اور عمرو بن عبید زیادہ مشہور ہیں۔[1] واصل ؔغزّالی میں سے ہیں۔ مدینہ منورہ میں سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ پھر وہاں سے بصرہ چلے گئے۔ امام حسن بصری ؒ سے استفادہ کیا اور سنہ ۱۳۱ھ میں انتقال فرمایا۔ یہ نہایت فصیح و بلیغ خطیب تھے۔ کلام پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ الفاظ نہایت آسان اور سہل استعمال کرتے تھے۔ ان کے بارہ میں کسی نے کہا ہے۔

علیم بابدال الحروف وقامع   لکل خطیب یغلب الحق باطلہ

(حروف کی تبدیلی سے بڑے واقف تھے۔ ہر خطیب کا منہ بند کردینے والے ان کی باطل باتیں بھی حق کے درجہ تک پہنچ جاتی تھیں)۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں مگر ہم تک ان کی کوئی کتاب نہیں پہونچ سکی۔

---

[1] احمد بن یحییٰ مرتضیٰ نے اپنی کتاب "المنیۃ والامل" میں جو کتاب الملل والنحل کی شرح ہے اور جس کی ایک جلد طبقات معتزلہ کے متعلق شائع ہوچکی ہے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اعتزال، اسلام کے صدر اول میں موجود تھا چنانچہ انھوں نے معتزلہ کے طبقۂ اول میں خلفائے اربعہ، عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعودؓ وغیرہ کو شمار کیا ہے۔ اور طبقۂ ثانیہ میں امام حسنؓ، امام حسینؓ، محمد بن الحنفیہ اور سعید بن المسیب وغیرہ کو شمار کیا ہے اور طبقۂ ثالثہ میں حسن بن الحسن، عبداللہ ابن الحسن، ابوہاشم عبداللہ بن محمد بن الحنفیہ کو شمار کیا ہے۔ ابوہاشم عبداللہ ابن محمد بن الحنفیہ واصل کے استاذ ہیں۔ طبقۂ رابعہ میں سے غیلان دمشقی اور واصل بن عطا کو شمار کیا ہے۔ الخ ان کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر اس شخص کو معتزلی شمار کرلینا چاہتے ہیں چاہے وہ صحابی ہوں یا تابعی جس سے کوئی ایسا قول منقول ہو کہ انسان اپنے عمل اور ارادہ میں آزاد ہے یا ان کا کوئی ایسا قول ملتا ہو جس سے افعال کا حسن و قبح عقلی ہونا معلوم ہوتا ہو۔ مثلاً انھوں نے ابوبکر صدیقؓ اور ابن مسعودؓ کے معتزلی ہونے پر اس امر سے استدلال کیا ہے کہ انھوں نے اس عورت کے نکاح کے بارے میں جس نے اپنا مہر اپنے شوہر کو تفویض کردیا ہے اپنی رائے سے فیصلہ دیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن و قبح کے عقلی ہونے کے قائل تھے جبھی تو انھوں نے اپنی رائے سے فیصلہ دیدیا تھا۔ ابن عباس کے معتزلی ہونے پر اس سے استدلال کیا ہے کہ انھوں نے مسئلہ جبر میں ایک شامی سے مناظرہ کیا تھا اور اس کے خلاف دلائل قائم کئے تھے۔ ان کا یہ مطلب نہیں معلوم ہوتا کہ اعتزال کا مذہب انہی موجودہ صفات کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے عہد سے موجود تھا۔

اسی طرح عمرو بن عبید بھی موالی تھے۔ امام حسن بصریؒ کے شاگرد ہوئے اور اعتزال میں واصل بن عطاء کی رائے کے مبلغ بن گئے۔ انھوں نے بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں جو ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ زہد و ورع میں نہایت مشہور تھے۔ ان کے بارے میں ابوجعفر منصور نے کہا تھا۔

كُلُّكُمْ يَطْلُبُ صَيْدًا غَيْرَ عَمْرِو بْنِ عُبَيْدِ

(تم میں سے ہر شخص شکار کی تلاش میں رہتا ہے سوائے عمرو بن عبید کے) ان کا انتقال حج سے واپسی میں ۱۴۵ھ میں ہوا۔

یہ دونوں (واصل اور عمرو) تقویٰ اور صلاح میں بہت مشہور تھے۔ اور درحقیقت مذہب اعتزال کے بانیوں میں ان دونوں ہی کو شمار کیا جاتا ہے۔

معتزلہ کی تعلیمات

معتزلہ کی تعلیمات کا خلاصہ مندرجہ ذیل اصول میں آجاتا ہے۔

(۱) دو درجوں کے درمیان ایک درجہ کا اعتراف یعنی یہ کہ مرتکب کبیرہ نہ کافر ہے۔ نہ مومن ہے بلکہ فاسق ہے۔ اور فاسق اپنے فسق کی وجہ سے جہنم کا مستحق ہے۔

اس قول کو پھیلانے کا سبب یہ بات تھی کہ سیاسی جنگیں۔ مثلاً شہادت عثمانؓ۔ واقعہ جمل۔ واقعہ صفین وغیرہ کی وجہ سے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ ان میں سے کون سا فریق حق پر تھا اور کون سا باطل پر؟ پھر یہ سوالات ہونے لگے کہ ان میں جو فریق خطاکار تھا وہ مومن تھا یا کافر تھا؟ خوارج ان لوگوں کو جو گناہوں کے مرتکب ہوئے کافر قرار دینے لگے اور مرجئہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ سب مومن تھے۔ حسن بصریؒ نے کہا کہ وہ منافق تھے۔ واصل نے کہا کہ وہ فاسق تھے اور اس کے کفر اور ایمان کے درمیان میں ایک درجہ ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ فاسق ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

تقدیر

(۲) تقدیر کا مسئلہ کہ خدا لوگوں کے اعمال کا خالق نہیں ہے بلکہ لوگ خود ہی اپنے اعمال کی تخلیق کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ ثواب و عقاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا ہی تنہا ان کا مستحق ہے کہ عدل کے ساتھ اس کا وصف کیا جائے۔ شاید ایسا کہنے پر انھیں جہم بن صفوان اور اس کے ساتھیوں کے اس قول نے مجبور کیا کہ انسان میں عمل کرنے کی قطعاً قدرت نہیں ہے۔ وہ محض ایک جماد کی طرح ہے۔ اس کے ہاتھوں سے اعمال کا صدور ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کسی پتھر سے ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ مورخین نے بیان کیا ہے کہ واصل بن عطاء نے اپنے کچھ ساتھیوں کو خراسان بھی بھیجا تھا کہ وہ وہاں جاکر جہم بن صفوان سے مباحثہ اور مناظرہ کریں۔

توحید

(۳) توحید کا قول۔ چنانچہ معتزلہ نے اس کا انکار کیا کہ خدا کے لئے علم، اور قدرت، حیات، سمع، بصر وغیرہم کی ازلی صفات ہوں جو اس کی ذات سے الگ ہوں۔ بلکہ خدا بایں معنی قادر، حی، سمیع اور بصیر ہے کہ وہ فی ذاتہٖ ایسا ہے۔ اس کی کچھ صفات اس کی ذات پر زائد یا ذات سے الگ نہیں ہیں۔ صفاتِ قدیمہ کے وجوہ کا قائل ہونا خدا کے تعدد کو مستلزم ہے۔ حالانکہ خدا واحد ہے۔ اس کا کسی جہت سے بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ اور یقیناً اس کی ذات میں کوئی کثرت نہیں

ہے۔ جو آیات ان صفات کو ثابت کرتی ہیں یا ان صفات کو اس طرح ثابت کرتی ہیں کہ خدا کے لئے ایسی ہی صفات ہیں جیسا کہ مخلوق میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسی تمام آیات کی معتزلہ نے تاویل کی ہے۔ ایسا کہنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کے زمانے میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو خدا کی تجسید (جسم ہونے) اور مخلوقات کی طرح اس کے لئے صفات ثابت کرنے کے قائل تھے۔ مثلاً واصل بن عطاء کے ہمعصروں میں سے مقاتل بن سلیمان کا نام لیا جا سکتا ہے۔

عقل کا غلبہ

(۴) وہ عقل کے تسلط کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ عقل خود حسن و قبیح کی معرفت حاصل کر سکتی ہے۔ خواہ شریعت نے کسی بات کے حسن و قبیح کو بیان کیا یا بیان نہ کیا ہو۔ ہر چیز کی ایک صفت ہوتی ہے جو اسے حسن یا قبیح بنا دیتی ہے۔ چنانچہ سچائی اور صدق میں ایک صفت ذاتی ہے جس نے اسے حسین بنا دیا ہے اور جھوٹ اور کذب میں ایک ذاتی صفت ہے جس نے اسے قبیح بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عقلاء اس بات میں شریک ہیں کہ فقیر پر احسان کرنا اور ڈوبتے ہوئے کو بچا لینا اچھی بات ہے اور محسن کی ناشکری کرنا۔ بے گناہ کو ستانا بری بات ہے خواہ اس کے متعلق انہیں شریعت کا کوئی حکم ہو یا نہ ہو بلکہ خواہ دہریے دین اور ملحد ہی کیوں نہ ہوں۔ شریعت نے کسی بات کا حکم دے کر اسے حسن اور اچھا نہیں بنا دیا اور نہ کسی بات سے منع کر کے اسے قبیح اور برا بنا دیا ہے بلکہ شریعت تو کسی کام کا اس لئے حکم دیتی ہے کہ وہ بات فی ذاتہٖ حسن اور اچھی ہوتی ہے۔ وہ بعض کاموں سے اس لئے روک دیتی ہے کہ وہ کام فی ذاتہٖ قبیح اور برے ہوتے ہیں۔ شریعت اس کے برعکس کر ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اس کے امر اور نہی تو درحقیقت اس قبیح اور حسن کے تابع ہوتے ہیں جو چیزوں میں فی ذاتہٖ موجود ہیں۔

اس اصول کو وضع کرنے کی بڑی وجہ غالباً کچھ لوگوں کا وہ غلو اور جمود تھا جو حدیثوں کے متعلق ان میں پایا جاتا تھا کہ حدیث خواہ وہ موضوع ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے بغیر وہ ایک ٹکا بھی نہیں توڑتے تھے۔ اگر انھیں کسی مسئلہ میں حدیث نہیں ملتی تھی تو اپنی رائے سے کچھ کہنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی تھی۔ مدرسۂ حدیث پر جہاں ہم نے گفتگو کی ہے وہاں ہم نے اس جمود کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ معتزلہ نے ان عظیم خطرات کو محسوس کیا جو آگے چل کر عقل کو اس درجہ تک شل کر دینے سے لوگوں کو پیش آنے والے تھے۔ لہٰذا انھوں نے یہ بنیاد ڈالی اور عقل کے تسلط کو آزادی عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی مخلوق میں معتزلہ سے سب سے زیادہ سخت ترین نفرت کرنے والے یہ حضرات علمائے حدیث ہی ہیں۔ اسی طرح علمائے حدیث سے نفرت کرنے میں معتزلہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ مامون اور معتصم کے دور خلافت میں حکومت معتزلہ کی تھی۔ انھوں نے فتنۂ خلق قرآن میں اہل حدیث کو بڑی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کیا اور جب محدثین کی باری آئی تو وہی کچھ معتزلہ کے ساتھ محدثین نے کیا۔

صحابہ پر تنقید

اسی طرح معتزلہ نے ان سیاسی معاملات سے بھی تعرض کیا جو ان کے زمانہ سے پہلے گذر چکے تھے اور ان میں بھی اپنے رائے دی۔ انھوں نے حسن بصریؒ سے اس بات میں اتفاق نہیں کیا کہ "یہ تو وہ خون ہے جن سے خدا نے ہماری تلواروں کو پاک رکھا ہے تو ہم ان سے اپنی زبانوں کو کیوں آلودہ کریں؟" بلکہ معتزلہ نے کہا کہ صحابہ خود آپس میں ایک دوسرے کی خوردہ گیری کرتے تھے اور ایک دوسرے سے جنگ کرتے تھے۔ صحابہ کی تنقید کے سلسلہ میں عمرو بن عبید سے

بہت کچھ نقل کیا جاتا ہے۔ وہ ابوہریرہؓ کو بہت برا بھلا کہتے تھے اور ان کی روایت میں طعن کرتے تھے۔ انھوں نے عمرو بن العاصؓ اور معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کو خائن ٹھرایا اور ان پر مال فئے میں چوری کرنے کا الزام لگایا۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ صحابہ کی تشریح و تنقید اور ان کے اعمال اور باہمی جنگوں کے متعلق فیصلے دینے کو اپنے لئے قطعاً مباح سمجھتے تھے۔ ان میں زیادہ تر جری اور بے باک وہ معتزلہ تھے جو شیعیت سے اعتزال میں آئے تھے[1]۔

سیاسی مسائل کے بارے میں ہم ان کی چند آراء نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔۔۔۔۔ تقریباً ۔۔۔ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ایک صحیح اور شرعی بیعت تھی۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلعم کی کوئی نص موجود نہیں تھی بلکہ یہ صحابہ نے اپنے اختیار سے کی تھی۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں کون افضل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت علیؓ؟ قدیم بصریین مثلاً عمرو بن عبید، نظام، جاحظ اور ہشام فوطی اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت علیؓ سے افضل تھے۔ بغدادی معتزلہ مثلاً بشر بن المعتمر اور ابوالحسین خیاط اس طرف گئے ہیں کہ حضرت علیؓ افضل تھے۔ اس مسئلہ پر ان میں باہم طویل مباحثے بھی ہوتے رہے ہیں۔ جب یہ حضرات واقعہ جمل تک آتے ہیں تو واصل بن عطاء تو کہتے ہیں کہ اس جنگ کی وجہ سے ان میں ایک فریق لامحالہ فاسق تھا۔ لیکن میں یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون سا فریق فاسق تھا۔ لیکن عمرو بن عبید صاف کہہ دیتے ہیں کہ باہم پیکار آزمائی کرنے والے دونوں فریق یکدم فاسق تھے۔ معتزلہ نے عمرو بن العاصؓ اور معاویہ بن ابی سفیانؓ سے، ان کی غلطیوں سے اور ان کے متبعین سے براءت ظاہر کی ہے۔ غرضیکہ اس انداز پر انھوں نے اسلامی تاریخ کے اکثر واقعات کی تحلیل کی ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ ان میں باہم اختلافات بھی ہوئے ہیں اور ہر فریق نے اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں کہ اس سے بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ (باقی)

---

[1] اگر تم اس کا نمونہ دیکھنا چاہو تو وہ رسالہ پڑھو جو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغت صفحہ ج ۴ و مابعد ہا میں ابوجعفر سے نقل کیا ہے۔

لاہور سے ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری کتابیں منگانے کے لئے

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور ۔۔۔۔۔۔۔۔ کو ایک کارڈ لکھ دیجئے

باب المراسلات

الاعتصام کے الزامات

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

" ۲۵ دسمبر کے اخبار الاعتصام میں "ایک بہت بڑا دھوکا" کے عنوان سے مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے جس میں متعدد گالیوں کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ دسمبر ۱۹۵۹ء کے طلوع اسلام کے ٹائیٹل پر مسلم کے حوالے سے جو حدیث لکھی گئی ہے اس میں "شیئًا" کا لفظ اپنی طرف سے بڑھایا گیا ہے۔ اور پوری حدیث نقل نہیں کی گئی۔ اسے الاعتصام نے بددیانتی۔ خیانت۔ بہت بڑا دھوکا۔ وغیرہ قرار دیا ہے۔ براہ کرم طلوع اسلام میں اس کی وضاحت فرمائیے۔ طلوع اسلام میں جس جگہ یہ حدیث درج کی گئی ہے نہ وہاں پرویز صاحب کا نام درج اور نہ پرویز صاحب طلوع اسلام کے ایڈیٹر ہیں (طلوع اسلام میں ایڈیٹر کا نام الگ لکھا ہے) لیکن الاعتصام میں یہ تمام گالیاں پرویز صاحب کا نام لے کر دی گئی ہیں۔ یہ چیز عام آدابِ صحافت کے بھی خلاف ہے۔ الاعتصام کو طلوع اسلام کو مخاطب کرنا چاہیئے تھا "

طلوعِ اسلام :- ہم نے جس وقت مذکورہ بالا حدیث نقل کی ہے تو مسلم کا نسخہ ہمارے سامنے نہیں تھا۔ اتفاق سے مولانا محمد جعفر شاہ صاحب ندوی کی کتاب "ریاض السنۃ" ہمارے سامنے تھی۔ اس کے صفحہ ۵۳ پر یہ حدیث مسلم کے حوالے سے بعینہٖ انہی الفاظ میں درج ہے ملاحظہ فرما لیجئے۔ ویسے بھی "شیئًا" کے لفظ سے نفسِ مضمون پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب رسول اللہ نے حکم دے دیا کہ من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ (جس شخص نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو وہ اسے مٹا دے) تو بات صاف ہو گئی کہ حضورؐ نے صرف قرآن لکھنے کا حکم دیا تھا اور غیر از قرآن لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔

(۲) حدیث کے باقی حصے کا بھی نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ وہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ طلوع اسلام نے کہا ہے کہ رسول اللہ نے حکم دے دیا تھا کہ آپ سے قرآن کے علاوہ کچھ اور نہ لکھا جائے۔ اس ضمن میں مسلم کی پوری حدیث (جیسے الاعتصام نے اپنے ہاں درج کیا ہے) حسبِ ذیل ہے۔ ترجمہ بھی الاعتصام ہی کا ہے۔

عن ابی سعید الخدری۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبوا عنی

ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔ وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی قال

همام احسب قال متعمداً فلیتبوأ مقعده من النار (صحیح مسلم، جلد ۲، کتاب الزہد باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابۃ العلم ص۴۱۴۔ اصح المطابع)

ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھ سے نہ لکھو۔ اور جس شخص نے مجھ سے قرآن کے سوا لکھا ہو اسے مٹا دے۔ اور میری حدیث روایت کرو اس میں حرج نہیں۔ (لیکن یہ یاد رکھو) جو شخص مجھ پر (حدیث کی سند میں ایک راوی ہمام ہیں جو کہتے ہیں مجھے گمان ہے۔ اس سے آگے میرے استاد نے کہا تھا) جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ سمجھ لے کہ اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا۔

اگر حدیث کے باقی حصے میں کتابتِ حدیث کا (کسی نوعیت سے) ذکر ہوتا اور طلوعِ اسلام اسے درج نہ کرتا تو اسے بددیانتی قرار دیا جا سکتا تھا لیکن جب اس میں کتابتِ حدیث کا کوئی ذکر نہیں تو اسے درج کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ (ضمناً تحریر ہے کہ ریاض السنۃ میں بھی حدیث کا باقیماندہ حصہ نہیں دیا گیا)۔

(۳) گالیاں وہی دیتا ہے جس کے پاس علمی دلیل اور سند نہ ہو۔ طلوعِ اسلام نے جو کچھ لکھا تھا اگر وہ غلط تھا تو اس کا صحیح جواب یہ ہو سکتا تھا کہ یہ حضرات بتلاتے کہ رسول اللہ کے زمانے میں احادیث کا فلاں مجموعہ مرتب ہوا تھا۔ لیکن یہ حضرات ایسا کہیں سے ثابت نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہ نے مرتب کرا کر امت کو دیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے مرتب کرایا۔ بلکہ حافظ ذہبی کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے اس سے سختی سے روکا اور بڑے غور و خوض کے بعد اس قسم کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ لہٰذا اس اہم اعتراض کا کوئی جواب ان حضرات کے پاس نہیں ہوتا اس لئے سوائے اس کے کہ یہ گالیاں دے کر اپنے متبعین کا خیال دوسری طرف منتقل کر دیں اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟

جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے۔ طلوعِ اسلام کو نہ (معاذ اللہ) احادیث سے کسی قسم کی دشمنی ہے۔ نہ سنتِ رسول اللہ سے (پناہ بخدا) کسی قسم کا بیر ہے۔ نہ یہ فرقۂ اہلِ قرآن سے متعلق ہے۔ اس کے سامنے دین کی ایک بنیادی دشواری ہے جس کا حل یہ برسوں سے طلب کر رہا ہے۔ یہ حضرات اس کا حل تو پیش کرتے نہیں (اس لئے کہ پیش کر ہی نہیں سکتے) اور اپنے اس عجز کو گالیوں کے گرد و غبار میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دشواری یہ ہے کہ

> اگر احادیث بھی قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل (مثلہ معہ) وحی خداوندی تھیں۔ اور انہیں جبریلِ امین اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح آیاتِ قرآنی کو۔ اور انہیں بھی قرآن کی طرح غیر متبدل دین کی حیثیت حاصل تھی۔ تو رسول اللہ کا یہ فریضہ تھا کہ آپ اس وحی کو مرتب فرما کر محفوظ شکل میں امت کو دیتے۔ لیکن حضورؐ نے ایسا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ خلفائے راشدینؓ نے (جنہوں نے قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں اتنا کچھ

۱؎ الاعتصام میں عربی عبارت اور اس کا یہ ترجمہ اسی طرح لکھا ہے۔

کیا) انھوں نے بھی احادیث نبویؐ کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا۔ تو اس سے انسان لامحالہ انہی نتائج پر پہنچتا ہے کہ

(۱) یا تو احادیث کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ اور

(۲) اگر ان کی حیثیت یہی تھی تو پھر (معاذ اللہ) رسول اللہ نے اپنا فریضۂ تبلیغ رسالت ادا نہیں فرمایا۔ اور دین کا یہ حصہ غیر محفوظ رہ گیا۔ اگر رسول اللہ کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ قرآن اور حدیث مخلوط نہ ہو جائیں (حالانکہ اگر دونوں وحی منزل من اللہ تھے تو ان کے مخلوط ہو جانے میں بھی کیا حرج تھا)۔ تو آپ قرآن کی الگ کتابت کراتے اور احادیث کی الگ۔ لیکن (الاعتصام کے الفاظ میں) "قرآن کی تو باقاعدہ کتابت ہوتی تھی" اور احادیث کی کتابت آپ نے نہیں کرائی۔

یہ ہے دین کے متعلق وہ بنیادی سوال جس سے پھر بیسیوں شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کیا جاتا۔ لیکن غور و فکر کی ہمارے ہاں عادت ہی نہیں رہی۔ یہاں ہر فرقہ (بلکہ ہر فرد) یہ سمجھتا ہے کہ وہ جس روش پر چل رہا ہے وہ عین حق و صداقت کی روش ہے اور جو شخص اس روش کے متعلق کوئی سوال کرے وہ دشمن دین، منکر خدا، منکر رسول (اور نہ جانے کیا کیا) ہے۔ اس لئے اس کا جواب گالی ہے۔ طلوع اسلام کا اتنا ہی قصور ہے کہ وہ مروجہ اسلام پر قرآن کریم کی روشنی میں غور و فکر کرتا ہے اور جو کچھ اسے (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآن کے خلاف نظر آتا ہے اس پر دعوت غور و فکر دیتا ہے اور اس کے جواب میں ہدف طعن و تشنیع بنتا ہے۔ یہ حضرات صرف گالیوں پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جھوٹے الزامات بھی تراشتے ہیں۔ مثلاً الاعتصام نے اپنے اس مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے۔

> جب آپ کے نزدیک احادیث کا سارا ذخیرہ غلط ہے تو یہ ایک حدیث کہاں سے آگئی۔

حالانکہ طلوع اسلام ایک بار نہیں سینکڑوں بار اعلان کر چکا ہے کہ اس کے نزدیک احادیث کے موجودہ مجموعوں میں بھی صحیح احادیث بھی ہیں اور غلط بھی۔ خود طلوع اسلام کے ٹائٹل پر برس دن سے احادیث شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن جن کی صحت ہی الزام تراشی میں ہو انھیں اس سے کیا غرض کہ فریق مخالف اپنے متعلق کیا کہتا اور کیا کرتا ہے۔

دوسرا الزام انہی صاحب نے اپنے دوسرے خط میں الاعتصام یکم جنوری ۱۹۶۰ء کے مقالہ افتتاحیہ کی طرف توجہ دلائی ہے، جس کا عنوان ہے ـــــ کیا یہ قرآن میں تحریف نہیں ـــــ اس میں اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ پرویز صاحب کی کتاب "نظام ربوبیت" میں قرآن کریم کی آیت لِيَأْكُلُوا أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ..... کو لِيَأْكُلُونَ (لام کے کسرہ کے ساتھ) لکھ دیا ہے اور اس کا ترجمہ بھی غلط کر دیا ہے۔

"نظام ربوبیت" میں کتابت اور طباعت کی کس قدر غلطیاں اور خامیاں رہ گئی ہیں اس کا اعلان اور (بہ صد تاسف) اعتراف

اس کتاب کے "تعارف" (ص ۲۸) کے آخر میں موجود ہے۔ لَیَاْکُلُوْنَ کی جگہ لِیَاْکُلُوْنَ (لام کے کسرہ کے ساتھ) اسی کا نتیجہ ہے۔

اب رہا آیت کا ترجمہ۔ سو الاعتصام نے "نظامِ ربوبیت" کے جس مقام کا حوالہ دیا ہے (یعنی ص ۲۸۶) وہاں آیت کا ترجمہ دیا ہی نہیں گیا۔ وہاں کتاب کے اہم نکات کو مسلسل بیان کیا گیا ہے اور محض حوالہ کی خاطر متعلقہ آیات درج کی گئی ہیں۔ یہ پرویز صاحب کی تحریر کا عام انداز ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔

انسانوں کے خودساختہ نظام میں ہمیشہ ایک طبقہ ایسا رہتا ہے جو خود کچھ نہیں کرتا اور دوسرے انسان ان تمام کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ بجائے اس کے کہ بھکاریوں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھے یہ معاشرہ میں سب سے اونچے مقام پر متمکن رہتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر براجمان ہو جاتے ہیں (لیاکلون اموال الناس بالباطل۔ ۹/۳۴) تاکہ عوام کی محنت کی کمائی کھاتے رہیں اور تخریبی نتائج پیدا کرتے رہیں۔

آپ نے دیکھا کہ اس میں عبارت مسلسل چلی آرہی ہے اور درمیان میں آیت محض حوالہ کے لئے دیدی گئی ہے۔ اس کا ترجمہ نہیں دیا گیا، مفہوم دیا گیا ہے۔ یہ صورت صرف اسی (ایک) آیت کے سلسلہ میں پیش نہیں آئی۔ اُن صفحات پر دوسری متعدد آیات کی بھی یہی صورت ہے یعنی انھیں بھی بطور حوالہ درج کیا گیا ہے۔ ان کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ مفہوم دیا گیا ہے۔

(۲) آیت (۹/۳۴) پوری کی پوری "نظامِ ربوبیت" کے صفحہ ۱۵ پر درج ہے اور اس کا ترجمہ بھی نیچے دیا گیا ہے۔ وہاں "لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" ہے اور اس کا ترجمہ ہے

یہ لوگوں کا مال تخریبی نتائج کے لئے (مفت میں) کھا جاتے ہیں۔

اگر الاعتصام کا مقصد الزام تراشی اور جھوٹا پروپیگنڈہ نہ ہوتا تو وہ اس کی صراحت بھی کر دیتا کہ دوسرے مقام پر یہ لفظ اور اس کا ترجمہ صحیح لکھا گیا ہے۔

یہ ہے اس الزام کی حقیقت جسے "قرآن میں تحریف" کہہ کر اس طرح بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ —— پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔

نہایت ضروری

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضروری دیا کیجئے۔ اس سے تعمیل میں تاخیر نہیں ہوتی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

اختلافِ قراءت

(محترم بشیر احمد سوی صاحب۔ مغلپورہ)

اب جبکہ یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ ظہورِ اسلام کے زمانے میں عربی رسم خط میں منقوط حروف پر نقطے دینے کا رواج نہ تھا اور قرآن شریف پر رسول اللہ صلعم اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں نقطے نہیں لگائے گئے تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کو اختتام تک پہنچایا جائے اور تحقیق کا حق ادا کیا جائے۔ ذیل کے امور پر تحقیقات فائدہ مند ہوگی۔

(۱) کیا یہ حقیقت ہے کہ زمانہ نبی صلعم اور دورِ صحابہؓ کی طرف منسوب متعدد مخطوطات جو مختلف میوزیم اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں، ان میں سے کسی میں بھی نقطے والے حروف پر نقطے موجود نہیں؟ (۲) ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے اور ان کے جعلی ہونے کا کہاں تک امکان ہے؟ (۳) اگر یہ حقیقت ثابتہ بھی ہو تو اس سے قرآن مجید پر جس کی کتابت کے ساتھ ساتھ زبانی تلقین ہوئی اور حفاظ ہر زمانے میں موجود رہے کیا حرف آ سکتا ہے[1]؟

اس بحث کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ علمائے لسانیات کا اس امر کے متعلق کیا فیصلہ ہے۔ ان علما نے مختلف زبانوں کی ابتدا، ان کے بننے اور بگڑنے پر خوب بحث کی ہے۔ اور زبانوں کے رشتوں سے اقوام سالفہ کے آپس میں روابط اور تہذیبوں اور تمدنوں کے تسلسل اور روانی کے رُخ کا پتہ لگایا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہ جیراجپوریؒ کا ایک مقالہ عربی خط کے متعلق جو مدت ہوئی رسائل میں شائع ہوا تھا اور اب علامہؒ مذکور کے مضامین کے مجموعہ "نوادرات" (شائع کردہ مکتبہ طلوع اسلام) میں شامل ہے مطالعہ کے قابل ہے۔ اس مفید مقالہ کا ملخص درج ذیل ہے۔

---

[1] اس صدی کے ابتدائی زمانہ میں اخبارات میں اس بات کا چرچا ہوا تھا کہ آنحضرت صلعم کے دادا عبدالمطلب کے ہاتھ کی ایک تحریر ملی ہے۔ اس تحریر کا چربہ (عکس نہیں) میں نے خود کسی رسالہ یا کتاب میں پڑھا ہے۔ یہ تحریر عبدالمطلب اور ایک اور شخص کے درمیان لین دین کا معاہدہ ہے۔ اس پر اعراب نہیں لیکن نقطے موجود ہیں اور عبارت ہر عربی داں پڑھ اور سمجھ سکتا ہے حوالہ حافظہ سے اتر چکا ہے لیکن تحریر کے موجود ہونے میں کلام نہیں۔ (سوی)

> مؤرخین کا بیان ہے کہ عربی خط سریانی خط سے نکلا ہے۔ سریانی حروف کی ترتیب ابجد، ہوز، حطی، کلمن سعفص، قرشت پر ہے۔ ابتدا میں عربوں نے بھی حروف تہجی کو اسی نہج پر رکھا ہے۔ اور چونکہ عربی میں چند حروف ایسے نکالے گئے جو سریانی میں نہیں تھے۔ اس لئے دو لفظ ثخذ اور ضظغ اور بڑھائے گئے۔ ان چھ زائد حروف یعنی ث۔ خ۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ غ کے لئے عربوں نے نئی صورتیں اختراع نہیں کیں بلکہ انھوں نے ہم مخرج حروف کی شکلیں ان کے لئے مستعار لیں...... انھیں حروف کو جو سریانی میں موجود ہیں ایک ایک نقطہ لگا کر عربی حروف بنالیا۔ صرف ض کی شکل عبرانی سے لی گئی ہے...... عبرانی سے ص کو لے کر اس پر ایک نقطہ لگا کر ض بنالیا۔ اور اس طرح عربی حروف کی تعداد ۲۸ ہوگئی اور ان کی شکلیں صرف ۱۷ رہیں۔ باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر کئے گئے......
>
> بعض لوگوں نے ایک یہ روایت مشہور کر رکھی ہے کہ عربی خط میں نہ پہلے نقطے تھے اور نہ حرکتیں۔ قرآن شریف کے مدون ہونے کے نصف صدی کے بعد نصر بن عاصم نے نقطے اور ابو الاسود دوئلی نے اعراب ایجاد کئے۔ یہ روایت غلط ہے۔ عربی خط میں کئی حرفوں کا ہم شکل ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ایجاد ہی کے وقت ان میں باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر کئے گئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ عربی خط کے موجد تین شخص ہیں مرار نے شکلیں وضع کیں۔ اسلم نے جوڑنے کا طریقہ نکالا اور عامر نے نقطے اور اعراب ایجاد کئے (یہ اشخاص ظہور اسلام کے زمانے سے بہت مدت پہلے گذرے ہیں۔ ناقل) ابو الاسود دوئلی نے اعراب نہیں ایجاد کئے بلکہ علم الاعراب یعنی نحو کے چند اصول ترتیب دیئے ہیں۔

علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ عربی خط ظہورِ اسلام سے پہلے تکمیل کی حد کو پہنچ چکا تھا۔ فن تاریخ کے امام علامہ ابن خلدون کے رتبہ و مقام کو کون نہیں جانتا۔ علامہؒ اس کے قول کو نقل فرماتے ہیں کہ

> دولت تبابعہ کے عہد میں ملک یمن میں خط عربی ضبط، استحکام اور خوبی کے لحاظ سے مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ ان میں تمدن اور شائستگی تھی۔ اس خط کا نام حمیری ہے۔ وہاں سے یہ خط منتقل ہو کر حیرہ آیا اور حیرہ سے مکہ اور طائف کے تاجروں نے سیکھا۔

آگے چل کر علامہ مرحوم لکھتے ہیں کہ

> حرکات کا عربوں کو اس قدر خیال تھا کہ معمولی اعراب کے علاوہ انھوں نے مد کی ایک علامت اختراع کی۔ اور مزید برآں اس کے اظہار کے لئے حرف علت کو بھی ضروری سمجھا۔ آنحضرت صلعم نے جو انگشتری بنوائی تھی اس میں لفظ "محمد" کے میم پر تشدید تھی۔

اگرچہ اہلِ حجاز میں اسلام سے قبل فنِ کتابت کا رواج عام نہیں تھا۔ لیکن ان کے گرد و نواح جو عربی قومیں آباد تھیں ان میں تمدن تھا۔

شائستگی تھی اور ان میں کتابت رائج تھی۔ اہل حجاز تجارت کی غرض سے ان اقوام سے روابط رکھتے تھے۔ چنانچہ تجارتی ضرورتوں کے لئے ان قوموں سے ان کا فنِ کتابت سیکھا جو اُس وقت تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔

اختلافِ قرأت کی بحث اور قرآن مجید کی حفاظت کے متعلق دو باتیں خوب ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ اول یہ کہ قرآن مجید کے نزول کے روزِ اول ہی سے قرآن کو حفظ کیا جاتا رہا ہے۔ عرب اور غیر عرب اقوام جو مسلمان ہوئیں ان سب میں حفاظ کی کثرت رہی ہے۔ اجتماعات میں حفاظ کے قرآن سنانے کا عام رواج رہا ہے (مثلاً صلوٰۃ رمضان میں ختم قرآن وغیرہ) واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون (۷/۲۰۴) (اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو (توجہ سے) سنو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے) اس پر شاہد ہے لہٰذا اختلافِ قرأت کا امکان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھا جائے تو نقطوں کی یہ بحث ACADEMIC بحث رہ جاتی ہے۔ اور قرآن مجید اس بحث کی لپیٹ میں نہیں آتا کیونکہ حفاظ کا وجود ہر زمانہ میں کثرت سے رہا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کی قرأت کا طریقہ ہمیشہ تعلیم و تعلم رہا ہے یعنی استاد سے سیکھنے کا۔ یہاں تک کہ عرب ممالک میں اہل زبان بھی قرآن سیکھنے کے لئے استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتے رہے ہیں اور آج بھی یہی طریقہ ہے۔

دوئم۔ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اور عربی زبان بھی اہل حجاز کی زبان تھی جو آنحضرتؐ کے قبیلہ کی زبان تھی وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه لیبین لهم (۱۴/۴) اس میں حکمت یہ تھی کہ قرآن مجید کے معلم اول کو زبانِ وحی کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو اور وہ خود بخوبی سمجھ کر دوسروں کو سمجھا سکے۔ اور اس سے کسی انسانی غلطی کا ارتکاب نہ ہو۔ لہٰذا قرآن اہل حجاز کی زبان میں مکتوب و مدون ہوا۔ اور خلفائے راشدینؓ نے بھی اس امر کو ملحوظ رکھا۔ حجاز کے گرد و نواح اور عرب کے دوسرے اقطاع میں جو قبائل رہتے تھے ان کے لہجے مختلف تھے اور وہ قرآن مجید کو اپنے لہجوں میں پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے جو میں سر سیدؒ کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں کہ "عربی زبان میں ایک ہی مادہ کے افعال کے لئے متعدد ابواب ہوتے ہیں اور ان ابواب سے ایک ہی مادہ کے مختلف طرح پر صیغے مشتق کئے جاتے ہیں۔ اور گو وہ لکھنے میں ایک ہی صورت کے ہوں۔ مگر ان کا تلفظ مختلف ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بعض لفظوں کو قرآن مجید کے کسی قاری نے کسی باب سے مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا۔ اور کسی نے دوسرے باب سے مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا۔ عرب میں بعض قومیں ان ابواب میں سے کسی باب کا استعمال کرتی تھیں اور بعض قومیں کسی باب کا۔ اور اسی سبب سے ان الفاظ کے تلفظ میں اختلاف ہو جاتا تھا۔"

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ باوجود اعراب کی ایجاد کے اہل زبان اب بھی ان کا استعمال عام تحریروں میں نہیں کرتے۔ اسی طرح حرفوں میں نقطوں کے دینے میں تساہل برتتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ نقطے ایجاد نہیں ہوئے تھے بلکہ اس لئے کہ بعض حروف بلا وضاحت بلا نقطہ اپنا کام دے دیتے تھے۔ مثلاً فعل مضارع کے پہلے حرف "ی" غائب کے صیغے پر اور حرف "ت" حاضر کے صیغے پر آتی ہے۔ لکھنے میں ان دونوں کی ایک صورت ہے فرق صرف یہ ہے کہ پہلے حرف کے نیچے دو نقطے ہوتے ہیں اور دوسرے حرف کے اوپر دو نقطے ہیں۔ غیر عرب اس کو کبھی پڑھ سکتا ہے اور سمجھ بھی لیکن اہل زبان کو اس میں دقت اور دشواری نہیں معلوم ہوتی۔ تاہم قرآن کو لکھنے یا اس کی آیات کو نقل کرنے میں شروع ہی سے احتیاط برتی گئی اور ہمیشہ اعراب اور نقطوں کو استعمال کیا گیا۔

نقد و نظر

IQBAL - HIS ART AND THOUGHT سید عبدالواحد صاحب (ریٹائرڈ انسپکٹر جنرل محکمہ جنگلات حکومت پاکستان) کی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۴۴ء میں حیدرآباد (دکن) سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے اور کتاب ہندوستان اور پاکستان میں کافی مقبول ہوئی۔ اب اس کا تازہ ایڈیشن لندن سے شائع ہوا ہے اور ان تمام صوری محاسن کا مرقع ہے جو ولایت میں چھپنے والی کتابوں کا امتیازی نشان ہوتے ہیں۔ اس ایڈیشن میں دو ابواب — اقبال اور ملٹن اور اقبال کی نثر نگاری — کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ چونکہ یہاں کا علمی حلقہ اس کتاب سے ایک عرصے سے متعارف ہے اس لئے اس پر جدید تبصرہ کی ضرورت نہیں (طلوع اسلام میں اس پر پہلے تبصرہ آ چکا ہے)۔ واحد صاحب کو اقبال سے عشق ہے۔ اور یہ تمام خارہ شگافی فرہادیٔ عشق کا نتیجہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اب مغرب میں بھی کافی مقبول ہو گی۔ پاکستان میں یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے مل سکے گی۔

یہ حقیقت بڑی تعجب انگیز ہے کہ اقبال کی ساری زندگی مغربی تصورات حیات اور تہذیب فرنگ کے خلاف جہاد میں گذری لیکن اس کی فکر کو عام کرنے کی سب سے زیادہ کوشش بھی مغرب ہی میں ہو رہی ہے۔ چنانچہ اقبال کی کئی اہم کتابوں کے تراجم یورپ کی متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں اور وہاں کا اہل فکر طبقہ (اپنے نقطۂ نگاہ سے) اس پر ریسرچ بھی کر رہا ہے (یہ الگ بات ہے کہ اس سے ان کا مقصود کیا ہے) اس کے برعکس خود اس کے اپنے گھر (پاکستان) میں اقبال کی فکر کو بری طرح سے مسخ کیا جا رہا ہے یا اسے فراموش کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جہاں بیس پچیس برس ادھر ہماری پوری دنیا اقبال کے پیغام سے معمور دکھائی دیتی تھی وہاں اب یہ حالت ہے کہ اقبال کا ذکر شاید ہی کہیں آتا ہو۔ بالخصوص ہمارے کالجوں کے طالب العلم تو اقبال کی کتابوں کے نام تک سے بھی بمشکل واقف ہوں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں ایک اچھا خاصا طبقہ ایسا موجود ہے جو شروع ہی سے اقبال کے نظریۂ پاکستان، نظریۂ وطنیت و قومیت، نظریۂ سیاست، تصور دین وغیرہ کا مخالف تھا۔ ان کی یہ مخالفت اب تک بدستور چلی آ رہی ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد اس طبقہ کی یہ منظم کوشش رہی ہے کہ قوم کو فکر اقبال سے بیگانہ بنا دیا جائے یا اسے اس رنگ میں پیش کیا جائے جس سے اس کا مفہوم ہی بدل جائے۔ کیونکہ یہاں بہ ہیئت مجموعی قوم بے مقصد زندگی بسر کر رہی ہے اس لئے جو گروہ بھی کسی مقصد کو لے کر اٹھتا ہے خواہ وہ مقصد کیسا ہی کیوں نہ ہو، بدبختی سے دوسروں کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ گروہ بھی (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے، اور اقبال کا پیغام ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

اقبال کا پیغام، دوسرے الفاظ میں خود قرآن کا پیغام ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اس لئے، اگر ملّتِ پاکستانیہ نے، مسلمان بن کر زندہ رہنا ہے تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہاں قرآن کی تعلیم عام ہو۔ فکرِ اقبالؒ قرآن فہمی میں بڑی حد تک مدد دیتا ہے۔ اس لئے ہماری درسگاہوں (کالجوں وغیرہ) میں اس کا عام چرچا نہایت ضروری ہے۔ اگر ملک کا آئندہ دستور، قرآنی خطوط پر متشکل ہو گیا تو پھر یہ منزلیں بہت آسان ہو جائیں گی۔ لیکن اس سے پہلے بھی حکومت جو کچھ اقبالؒ کے نام پر دے رہی ہے، اسے اس مقصد کے لئے صرف کیا جائے، تو اس سے خوشگوار نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تشکیلِ جدید کی جو اسکیم سامنے لائی گئی تھی، ہم نے حکومت کی توجہ خاص طور پر اس طرف منعطف کرائی تھی۔

الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ

تانا بانا

ہیں اُس جنّتی معاشرہ کا جسے قرآن

"حسن مآب"

(خوشگوار مستقر) قرار دیتا ہے

یہ معاشرہ کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب

نظامِ ربوبیّت (از پرویز)

ملاحظہ کیجئے

رعایتی قیمت ——— چار روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷- بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

(نوٹ) مکتبہ طلوعِ اسلام سے تمام بلند پایہ کتابیں مل سکتی ہیں